Fikr-o-Nasar (Islamabad) 45:2 (2007)

فکر و نظر............ اسلام آباد   جلد: ۴۵   شمارہ: ۲

فقہ التحیّز *

(جانب داری)

تصنیف: عبدالوہاب المسیر ی**   ترجمہ: عمر فاروق***

مغرب کے فکری نظام کی طرف جھکاؤ

تہذیبی نظام دراصل، معینہ نظامِ اقدار کے حامل ایک مکمل علمی و فکری نظام کا نمائندہ ہوتا ہے جس سے کسی تہذیب کی علیٰحدہ شناخت متعین ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آیئے پہلے کچھ مثالیں دیکھتے ہیں:

چند مثالیں

گفتگو کے دوران ہاتھ ہلانا ہمارے ہاں پر جوش ہونے کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے، لیکن 'اینگلو سیکسن' مغربی ممالک میں یہ بات گنوار پن اور نسلی و طبقاتی لحاظ سے گھٹیا ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے لیے بات کرنے میں ہاتھ کا ہلانا مخاطب سے تعلقِ خاطر کے گہرے احساس اور بات جاری رکھنے، نیز اس چیز کا اظہار ہے کہ زبان کے الفاظ ما فی الضمیر کو پورے طور پر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جبکہ 'معاملاتِ من و تو' میں سود و زیاں کا خیال رکھنے والی مادی، وضعی تہذیب میں جس بات کا الفاظ کے ذریعے پورا پورا اظہار نہ ہو سکے، اسے طاقِ نسیاں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ان کے ہاں فقط اُنہی لوگوں (اٹلی وغیرہ سے آئے نئے مہاجروں) کا سلسلۂ تکلم ہی عام طور سے ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے جن کی 'اینگلو سیکسن تہذیب' کے پروردہ پیمانوں کے مطابق تربیت نہیں ہوئی ہوتی(۱)۔ ہمارے ہاں کے فنِ خطابت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ تقریر کے دوران مقرر کیسے جملوں کی ادائیگی اور الفاظ کے زیر و بم سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلا کر سامعین پر سحر کارانہ اثر

---

* یہ ایک طویل مقالہ ہے، جسے تین اقساط میں پیش کیا جائے گا، دوسری قسط نذرِ قارئین ہے۔

** عبدالوہاب المسیر ی مصر سے تعلق رکھتے ہیں، بنیادی طور پر انگریزی اور تقابلی ادب اُن کا موضوع رہا اور اسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اہرام فاؤنڈیشن مصر میں بطور ماہر صہیونی امور کام کیا اور پھر صہیونی یہودی افکار اُن کے تجزیاتی مطالعہ جات کا خاص موضوع بن گئے۔ عربی اور انگریزی میں اُن کی بہت سی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، بہت سے تحقیقی مقالہ جات بھی علمی مجلّات کی زینت ہیں، اُن کا ایک اہم مقالہ ''العلمانیۃ: رؤیۃ معرفیۃ'' ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے عربی مجلّہ ''الدراسات الاسلامیۃ''، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۴ء شمارہ: ۴، میں شائع ہوا۔ مسیری بقید حیات ہیں مگر سرطان کے موذی مرض کا شکار ہیں۔

*** ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DMHL

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.   http://iri.iiu.edu.pk/

ڈال سکتا ہے۔ جبکہ مغرب کا فنِ تقریر ایک آدھ بار اور چند ثانیے سے زیادہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ، ہاتھ کی جنبش کا اپنا ایک کردار ہے جو عام متکلم کے لیے غیر شعوری اور جبلی انداز کی حامل ہوتی ہے، لیکن خطابت کی تعلیم دینے اور حاصل کرنے والے کے لیے اس کی حیثیت شعوری ہوتی ہے۔ دورانِ گفتگو ہاتھ کا الفاظ اور مطلب و مفہوم کا ساتھ دینا شعوری عمل ہو یا غیر شعوری، متکلم کا اس کے پیچھے کارفرما تہذیبی تصور ہی مخاطب کے لیے انگیخت (stimulant) کا کردار ادا کرتا ہے اور اس کا ردِّعمل (response) بھی متعین کرتا ہے۔

جاپانی اور امریکی سائنس دانوں کی دو ٹیموں نے الگ الگ لیکن ایک جیسے ماحول میں بندروں کے ایک مجموعے کی عادات کا مطالعہ کیا۔ امریکی سائنس دانوں نے بندروں کی یکساں تعداد کے چند گروپ بنا کر ان کی حرکات و سکنات اور آپس میں ان کے سلوک کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے مقابل جاپانی سائنس دانوں نے بندروں کو ان کے خاندانوں میں تقسیم کیا اور ہر خاندان کو علٰیحدہ نام دے کر ان میں ہر فرد کا ایک نام رکھ دیا۔ دونوں ٹیموں نے یہ ملاحظہ کیا کہ بندر ٹماٹر کھانے سے پہلے اسے پانی میں ڈبوتے ہیں۔ امریکیوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بندر دراصل ٹماٹر دھو کر کھاتے ہیں۔ جاپانی سائنس دان کچھ مختلف بات نوٹ کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ سارے بندر ایسا نہیں کرتے، بلکہ ان کے کچھ خاندان ٹماٹر کھانے سے پہلے اسے پانی میں ڈبوتے ہیں، اور وہ بھی اس لیے کہ کھاری پانی کے ساتھ ٹماٹر کا ذائقہ انھیں اچھا لگتا ہے۔ یہاں ہمارے لیے قابلِ ملاحظہ بات یہ ہے کہ امریکیوں نے سارے بندروں کو ایک نظر سے دیکھا، یا زیادہ سے زیادہ عددی مجموعوں کی شکل میں جن کے مابین کوئی خاندانی روابط ہیں نہ وہ الگ سے کسی خصوصیت کے حامل۔ گویا ان کے نزدیک بندروں کی عادتیں عام اور افادی نوعیت کی ہیں اور وہ فقط مطالعے کا معروضی یا ظاہری موضوع ہیں۔ اس کے برعکس، جاپانیوں نے فیملی کو بندروں کی عادات کے مطالعے میں بطور اکائی (یونٹ) منتخب کیا اور ان کی الگ الگ خصوصیات کو افادی یا ظاہری لحاظ سے نہیں، بلکہ نسلوں کے تہذیبی عمل کے نتیجے اور خوشی کے حصول کے طور پر لیا۔

بازار کی گہما گہمی میں چلتے چلتے اچانک آپ کا قدم کسی دوسرے شخص کے پاؤں پر جا پڑتا ہے۔ آپ اس سے معذرت کرتے ہیں۔ وہ اس کا جواب یوں دیتا ہے کہ 'کوئی بات نہیں، بازار میں بہت رش ہے، ایسا ہو جاتا ہے'۔ ممکن ہے ساتھ وہ اس جملے کا اضافہ بھی کر دے کہ 'خدا رحم کرے اور کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ رکھے'۔ اس کے برعکس، دوسرا کوئی شخص اس قسم کی صورتِ حال میں یہ جواب دیتا ہے: مَیں آپ کی (تمھاری) اس معذرت کو کونسے بنک میں جا کر کیش کراؤں، میرا نیا جوتا

خراب ہو گیا ہے۔ کوئی پاس سے گزرنے والا اسے منہ پھٹ جواب قرار دے سکتا ہے، اور ممکن ہے وہ اسے عین درست ردِ عمل قرار دے۔ اس تمام صورتِ حال میں ہم دیکھتے ہیں کہ معذرت کرنے والا ایک تہذیبی قدر کے طور پر (جان بوجھ کر اور سوچے سمجھے طریقے پر نہیں بلکہ) انجانے میں سرزد ہو جانے والی خطا کی معافی مانگتا ہے۔ یہ عمل آپس میں بھائی چارے اور امن و سلامتی سے رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ایک داخلی کیفیت ہے اور اس کی ایک معنوی قیمت ہے جو آپ کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے۔ جبکہ مادی عوض چاہنے والے کے نزدیک بنک اور پیسہ ہی واحد حوالہ و بدل ہے، جو حواس و قیاس کی خالصتاً مادی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔

رومن مؤرخ پلوٹارک نے کہا: (جب چراغ گل کر دیے جائیں تو سب عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں)۔ یہ 'قولِ زریں' شاید اس نے ایک 'بے حیا لطیف نکتے' کے طور پر کہا ہو اور اس کے 'تصورِ کائنات' پر بھی دلالت نہ کرتا ہو، کیونکہ چراغ بجھانے سے پہلے اور پھر سے روشن کرنے کے بعد خوشی، غمی، تعلق اور لاتعلقی کے ان گنت لمحے بھی تو ہوتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود یہ 'خوبصورت مقولہ' کہنے والا شخص انسانی لحاظ سے اباحیت پسند اور مادی سوچ کا حامل ہو گا، جو انسان کو فقط گوشت پوست کا مجموعہ خیال کرتا ہے، اور وہ بھی سرِ بازار بکنے کے لیے لٹکایا گیا گوشت۔ اس کے نزدیک بتی بند کرنے سے پہلے اور جلانے کے بعد والی زندگی کے لمحات کوئی حیثیت نہیں رکھتے جن میں انسان کی 'عالم گیر دیوانگی' کے شہوانی و حیوانی جذبے کی وقتی تسکین سے ہٹ کر اس کی انسانیت کا اظہار ہوا کرتا ہے، اور وہ 'دل کا غبار نظروں سے ہٹا کر' دنیا کو دیکھتا ہے(۲)۔ لیکن انسان کے مادی تجزیہ وتعبیر میں سب عورتیں آخر الامر صارف کے استعمال میں آنے والا ایک مادی عنصر ہیں، جو بتی بجھانے کے بعد اپنی رہی سہی انسانی خصوصیت بھی کھو دیتا ہے۔ 'روشن خیالی' کے دور کا یہ سب سے 'اہم درس' ہے جو پرانے زمانے میں شاید کم اہمیت کا حامل رہا ہو گا۔ انسان سے اس کی انسانیت سلب کر لی جائے تو وہ ('باڈی کیمسٹری'، 'کیمیکل ری ایکشن' اور) 'علامتوں کے گورکھ دھندے' والی جبریت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تہذیب (یا شاید بد تہذیبی) کا یہ علمی نظام بظاہر امید و رجا کا علم بردار نظر آتا ہے، کہ کام اور اس کے بعد شکمی و جنسی شہوت کی فوری تسکین سے تازہ دم ہو کر 'تعمیر و ترقی' کے لیے پھر سے کام، جس کے بعد پھر 'لذت و خوشی' کے لمحات دستیاب ہوں گے۔ شاید یہ طرزِ عمل پرانے تہذیبی رویوں کے کھوکھلا اور مسخ ہو جانے پر (کہ مروّتوں میں 'عشق ہوا نہ کام ہوا')، ایک اتھلے ننگے متبادل کے طور پر سامنے آیا ہو، لیکن نتیجے کے لحاظ سے یہ نیا نظام انسان اور زندگی کے بارے میں اپنے اندر آخری درجہ کی قنوطیت اور [صوفیوں کی خانقاہوں تک محدود پرانی فنائیت کے مقابل ایک اجتماعی نوعیت

کی] فنائیت چھپائے ہوئے ہے۔ اس میں خوشی کے قہقہے بالآخر جبریت سے نجات کی خاطر کسی سہارے میں تسکین نہ پانے پر بے ہنگم اچھل کود اور خواہ مخواہ کی چیخ و پکار میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ [صوفیانہ ہاؤ ہو اور ان میں مولویہ فرقے کا خاص گردابی رقص(۳) پرانا مشرقی انداز ہے]۔ عمر خیام نے جب اس صورتِ حال کو اپنے 'آئینۂ ادراک' میں دیکھا تھا تو زمانے پر لعنت بھیجتے ہوئے (اپنی تمام تر سائنسی اور علمی سوچ کے با وصف) ذاتی تسکین کی خاطر رباعیات میں شراب کی محفل سجائی اور 'عدمیت کا فلسفہ' اپنا کر کائنات کو 'دفترِ بے معنیٰ' قرار دیا، [جسے حافظِ شیراز کے نزدیک 'غرقِ مئے ناب' کر دینا 'اَولیٰ و افضل' ہے، کہ آخر میں، بقولِ اقبال، فطرت کی: غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا]۔

ذیل کی گفتگو آپ کو بہت سی جگہوں پر سننے کو ملے گی:

- آپ کیا کرتی ہیں؟
- میں فقط ایک خانہ دار خاتون ہوں۔
- آج آپ نے کیا کِیا؟
- کچھ بھی تو نہیں۔

یہ مکالمہ میں نے ساٹھ کی دہائی میں اپنے قیامِ امریکہ کے دوران ہزاروں دفعہ آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر بیشتر خواتین کے منہ سے سنا۔ اُس وقت وہاں آزادیِ نسواں کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی، نہ ابھی تک عورت کو زندگی کے دائرے کا مرکز مانا گیا تھا۔ اب یہی مکالمہ ہم اپنی مشرقی خواتین کی زبان سے سنتے ہیں۔ اس مکالمے کو تجزیاتی انداز میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

- آپ کیا کرتی ہیں؟ (واضح رہے کہ کام تو وہی ہے جو گھر سے باہر کی 'پبلک لائف' میں انجام دیا جاتا ہے، کہ جس کا کوئی حساب کتاب اور معاوضہ و بدل ہو۔ اس سے ہٹ کر بچوں کی تربیت اور گھر کی دیکھ بھال ایسے 'ذاتی زندگی' کے کاموں کی انسانی سطح پر یقیناً بڑی قدر و قیمت ہو گی ، لیکن یہ کوئی کام تو نہ ہوا۔ یہ تو گھر کے اندر انجام پاتا ہے، جس کے لیے کوئی اجر و عوض ہے نہ ماپنے کا کوئی مقداری پیمانہ۔ اگر آپ یہ کہیں کہ گھر میں بیوی اور ماں کی حیثیت انسانی اقدار کے محافظ اور نسلوں کے مربی کی ہوتی ہے تو یہ ایک غیر علمی اور غیر سائنسی بات ہے، جس کی واضح طور پر نظر آنے والی کوئی مادی صورت نہیں نکلتی۔ اس لیے یہ نہ کہیے کہ آپ کا گھر میں رہ کر اپنے عائلی، سماجی فرائض ادا کرنا کسی دفتر میں کام کرنے سے زیادہ معاشرے کے لیے سود مند ہے۔ اب زمانہ نئے انداز کا ہے،

جس میں 'سب عورتوں' کے لیے ضروری ہے کہ گھر سے نکل کر دکان ہو یا فیکٹری اور دفتر، ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں تا کہ معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے)۔

- (اگر میں آپ کی یہ توجیہ تسلیم کروں ، اور کیوں نہ تسلیم کروں کہ یہی تو واحد علمی اور سائنسی توجیہ ہے جسے مادی و افادی پیمانوں سے ماپا جا سکتا ہے تو) میں فقط ایک خانہ دار خاتون ہوں، (اور گھر میں رہتے ہوئے جو کام میں کرتی ہوں وہ کوئی کام نہیں)۔

- آج آپ نے کیا کِیا؟

- (اگرچہ میں نے گھر کی صفائی کی، کھانا پکایا، بڑے بیٹے کو تیار کر کے اسکول بھیجا، چھوٹی بچی کو نہلایا، کپڑے دھوئے اور خاوند جب کام سے واپس آیا تو اس کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ یوں سب کی دیکھ بھال کی اور گھر میں اطمینان و سکون کا ماحول برقرار رکھا۔ لیکن ان تمام کاموں کے باوجود، جو گھر میں اور گھر کے حوالے سے کیے گئے، کہ جن کا مجھے نظر آنے والا کوئی ظاہری معاوضہ نہیں ملتا، نئے تصور کے مطابق میں نے) کچھ بھی تو نہیں (کِیا)۔

اس طرح کی 'سادہ اور معصوم' گفتگو میں (کام) کا لفظ اپنے اصل معنوں سے ہٹ کر ایک خاص آئیڈیالوجی کی حامل اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جس کا مفہوم مغرب کے سیکولر علمی نظام کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کام اب وہ ہوا جو گھر سے باہر کی عام زندگی (پبلک لائف) میں انجام پائے اور جس کا کوئی معاوضہ ہو، جو انسان اقتصادی لحاظ سے انجام دے اور جسے پیداوار و صَرف یا رسد اور طلب کے پیمانوں سے ماپا جا سکے، جو فیکٹری اور منڈی میں کام کہلائے اور اسے کرنے والے کی حرکات و سکنات کا 'استحصالی نقطۂ نظر' سے جائزہ لیا جا سکے۔ جہاں تک ذاتی اور گھریلو زندگی کا تعلق ہے، تو اس میں انسان پیداواری آلہ نہیں، انسان ہوتا ہے، جو بہت سے انسانی نوعیت کے کام سر انجام دیتا ہے جن کو تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں ماپا جا سکتا۔ اس لیے وہ کام نہیں کہلائیں گے اور نہ ان میں سے بیشتر کو کسی علم یا مطالعے کا موضوع بنا کر فہم و قیاس میں لایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مادی و افادی نقطۂ نظر سے کچھ نہ کرنے والی بے چاری یہ گھریلو خاتون، انسانی اور معاشرتی حوالے سے اپنی خانہ داری کے دائرے میں رہتے ہوئے بہت کچھ کر چکی ہے۔ مگر اب چونکہ وہ سوچ فہم کا مادی حوالہ اپنا چکی ہے، لہٰذا اس نے 'کوئی کام نہیں کیا'۔ یوں اس کے لیے لازم ٹھہرا کہ فوراً گھر سے نکلے تا کہ کام کر سکے، ایسا کام جس پر کوئی مادی، مالی اجر و معاوضہ ملے اور وہ معاشرے کی نظروں میں 'احترام کے قابل' ٹھہرے، خواہ اس کے بچے بگڑ جائیں، گھر برباد ہو جائے اور وہ تہذیبی

خاصیت ختم ہو جائے جس کے تحت ماں بچوں کی پرورش بھی کرتی ہے اور تہذیبی قدروں کے مطابق تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ لیکن اب یہ امور ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور سب یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ کام تو وہ ہے جو اقتصادی نوعیت کا ہو، جیسے کھوے سے کھوا چھلتے بازار میں اس شخص نے کہا: (تمھاری اس معذرت کو میں کس بنک میں کیش کرواؤں)، یا جیسے پلوٹارک نے کہا: (چراغ گل ہو جانے کے بعد سب عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں)۔

ایک نظر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے بیانات اور خبروں پر بھی ڈالتے چلیں۔ (رواروی میں تماشا بھی دیکھتے چلیے)۔ پہلے عالمی بنک اور اس کے اقتصادی ماہرین کے بیانات اور وضاحتیں۔ بنک کے ایک بڑے ذمہ دار نے بیان جاری کیا کہ مغربی ممالک اپنے کیمیاوی، ایٹمی اور دیگر تابکار و غیرتابکار فضلہ جات پھینکنے کے لیے افریقا کے بیکار پڑے وسیع و عریض علاقے وہاں کے ممالک سے مناسب رقوم کے عوض کسی معینہ مدت کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ یوں ان فضلہ جات سے نجات پانے کے ساتھ اپنی 'مالی اعانت' سے افریقی ممالک کی تعمیر و ترقی میں بھی مدد دے سکتے ہیں۔ عالمی سطح پر اس بیان کے خلاف سخت احتجاج ہوا کہ یہ بات نہ صرف افریقا کو کوڑا کرکٹ کا ڈھیر قرار دینے اور وہاں کے باشندوں کی توہین کے مترادف ہے، بلکہ نام نہاد تعمیر و ترقی کے بدلے میں اس سرسبز و شاداب، زرخیز برِّ اعظم کی زمینوں کو بھی بنجر کر دینے کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ عالمی بنک نے انکار کیا کہ اس کے کسی ذمہ دار نے یہ بیان دیا ہے، لیکن 'جنابِ ذمہ دار' نے پوری ذمہ داری اور 'اطمینانِ قلب' کے ساتھ وضاحتی بیان جاری کیا کہ اس نے مذکورہ بیان دیا ہے اور وہ بنک کی بنیادی اصولی پالیسیوں کے عین مطابق ہے، جن میں معاشی اور افادی نقطۂ نظر کے تحت دنیا کسی بھی مقصد کے لیے محض ایک قابلِ استعمال مادی وجود ہے جس میں ہر چیز کی ایک مادی و مالی قیمت ہے۔ مجھے بتایئے کہ عالمی بنک کے اس نقطۂ نظر میں آیا انسان کا کوئی حوالہ پایا جاتا ہے؟

میرا ایک دوست عالمی بنک میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔ بنک نے اسے افریقی ممالک میں ایک بڑا ترقیاتی منصوبہ بروئے کار لانے کے لیے بھیجا۔ وہ منتخب کردہ علاقے میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں سے مل کر انھیں منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا، تو اسے بتایا گیا کہ اس کام کے لیے جنگلات کا بہت سا علاقہ صاف کرنا پڑے گا، جس سے سائنس دانوں کی نظروں سے اوجھل بہت سی طبی فوائد کی حامل بوٹیاں اور نادر جنگلی حیات کے بھی مٹ جانے کا خدشہ ہے۔ علاوہ ازیں، اس سے لوگوں کی معاشرتی روایات اور خاندانی زندگی بھی متأثر ہوگی، جس کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ پھر اس نے ماحول اور لوگوں کے تحفظ کے لیے کیا کِیا؟ اس کا

جواب تھا: کچھ نہیں، میرے پاس بنک کی طرف سے کام کا مقررہ پروگرام تھا، جس میں تاخیر کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ 'کام کی صلاحیت' اور 'تیزی' کے عنصر نے ماحول سے ہم آہنگی کو کیسے نظر انداز کر دیا اور اس چیز کا حساب بھی نہیں رکھا کہ ترقی کی خاطر لوگوں کو کتنی بھاری 'تہذیبی قیمت' ادا کرنا پڑی!

ذیل کا قصہ ایک دلچسپ خبر کے طور پر شائع ہوا۔ کسی اخبار کی ایک فوٹو گرافر خاتون اپنے میاں کے ساتھ ایتھوپیا کے ایک کھلے جنگلی پارک میں 'سفاری ڈرائیو' پر تھی کہ اچانک گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور خاوند نیچے گر پڑا۔ شکار کی تلاش میں نکلے شیر فوراً جست لگا کر اس پر آ جھپٹے۔ بیوی نے (بطور بیوی) خاوند کی مدد کرنا چاہی، مگر ایسا نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نے (بطور صحافی فوٹو گرافر) شیروں کا اس کے خاوند کی 'تکا بوٹی کرنے کا یادگار منظر' اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ بعد میں یہی تصاویر فوٹوگرافی کے ایک مقابلے میں بھی پیش کیں، جہاں وہ کسی نازک لیکن نادر لمحے پر فوٹوگرافر کی حاضر ذہنی کے باعث اول انعام کی مستحق قرار پائیں۔ لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ انعام دینے والی کمیٹی نے آپس کی مودت، خاندانی رشتوں اور تعلقِ خاطر کے سبب دوسرے کا دکھ محسوس کرنے جیسی داخلی انسانی اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے 'فرض کی ادائیگی'، انتہائی سرعت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور ماحول اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے ایسی خارجی، مادی اقدار کو وقعت دی اور ان کے لیے (تحیُّز) اختیار کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک انفرادی فعل ہے جس سے کسی تہذیبی یا فکری نظام کے اصل خط و خال کا اندازہ لگانا ٹھیک نہیں۔ چلیے ایسا ہی سہی، لیکن ذیل کے واقعات کا ہم انسانی یا شخصی حوالے سے کیا جواز ڈھونڈیں گے۔

شیورلے گاڑیاں بنانے والی کمپنی نے نئی ساخت کی ایک 'مزے دار' کار تیار کی، لیکن (جدید تر ٹیکنالوجی کے تمام تر استعمال کے باوصف) اس میں ایک خامی رہ گئی، جس کے باعث موڑ مڑتے وقت کار الٹ جاتی اور اس میں سوار افراد ہلاک بھی ہو سکتے تھے۔ چنانچہ کمپنی نے طے کیا کہ گاڑی مارکیٹ سے اٹھا لی جائے۔ لیکن کمپنی ہی کے ایک ذہین و فطین مشیر نے 'ایڈوائز' کیا کہ گاڑی مارکیٹ میں رہنے دی جائے؛ اس نے بڑی عرق ریزی سے حساب لگایا ہے کہ گاڑیوں کی تعداد کے لحاظ سے ممکنہ طور پر ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو ادا کیے جانے والے معاوضہ جات کی رقم، گاڑی مارکیٹ سے اٹھا کر اس میں تبدیلی و ترمیم کرنے کے عمل سے ہونے والے خسارے سے کہیں کم نکلتی ہے۔ چنانچہ ان نئے 'ذہین تر اعداد و شمار' کی روشنی میں کمپنی کی 'ایڈوائزری کمیٹی' نے اپنا پچھلا فیصلہ واپس لے لیا۔ گاڑی فروخت ہوتی رہی، لوگ مرتے رہے اور بہت سے اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کر معذور بھی ہوئے۔

جب ہرجانے کے لیے عدالت میں دعوے دائر کیے گئے تو کمپنی نے کامیاب حساب کتاب کی بدولت مناسب ادائیگیاں کر کے معاملات درست کر دیے۔

امریکی صدر ایزن ہاور نے اٹامک انرجی کمیشن کے نام ایک خفیہ مراسلہ جاری کیا کہ ایٹمی تابکاری اور نیوکلیئر تجربات سے ماحول اور انسانی زندگی کو درپیش خطرات کے بارے میں کسی قسم کی کوئی 'بریفنگ' دی جائے نہ وضاحتی بیان جاری کیا جائے۔ شاید ہمارا یہ خیال ہو کہ انسانی حقوق کے علم بردار ممالک میں اس قسم کی سوچ میکارتھی دور (Micarthian Age) اور 'ازمنۂ مظلمۂ' میں ہی پائی جاتی تھی، اب نہیں...... خیر، اگلی مثال دیکھیے۔

امریکی جریدے نیوز ویک میں ایٹمی تجربات اور تابکاری کے حوالے سے ایک 'سٹوری' شائع ہوئی، جس کا آغاز (سابقہ) امریکی وزیرِ قوت و پیداوار ہیزل اولیری کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: (اب صفائی کا وقت آن پہنچا ہے)، یعنی 'نیوکلیئر انرجی کی پھیلائی گندگی' کو صاف کرنے کا وقت۔ اس 'براعۃ الاستہلال' کے بعد وزیرہ موصوفہ نے دھوکا دہی اور تا حال برقرار خطرے کے ایک حیران کن اور دہشت آمیز قصے کا انکشاف کیا۔ وزیر نے بتایا کہ ۱۹۶۳ء میں دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان فضا میں ایٹمی تجربات نہ کرنے کے معاہدے سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے دورانیے میں امریکا نے دو سو چار زیرِ زمین نیوکلیئر تجربات کیے، اور کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے 'اٹامک انرجی کمیشن' نے تابکاری کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے قریباً چھے سو امریکی باشندوں کو تابکار عناصر کا ہدف بنایا۔ دس افراد کو ان کی مرضی کے خلاف پلوٹونیم کے انجکشن لگائے گئے۔ تا حال کوئی چوبیس میٹرک ٹن نیوکلیئر بموں میں استعمال کے قابل پلوٹونیم امریکا کی چھے ریاستوں میں ذخیرہ کیا پڑا ہے اور اس کے ضائع کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ چھے ملین پاؤنڈ کے قریب تابکار فضلہ جات ٹینکروں میں پڑے تابکاری چھوڑ رہے ہیں۔ گویا ماضی کی غلطیاں بھگتنا پڑ رہی ہیں۔ ۱۹۴۵-۴۷ء کے ما بین انسانی جسم میں پلوٹونیم کے نفوذ کی رفتار جانچنے کے لیے قومی سطح پر اٹھارہ اشخاص کو ہدف بنایا گیا، جن میں گھریلو خواتین، نو جوان، عمررسیدہ افراد، نیگرو باشندے اور ایک چار سال کا بچہ بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب امریکی شہری تھے(۴)۔ اگر اپنوں کے ساتھ یہ سلوک ہو سکتا ہے تو غیر پھر غیر ہیں۔ (غیر تو غیر ہیں غیروں کا بھلا کیونکر ہو!)۔ ان افراد میں ایک پینتالیس سالہ جان موسو نامی شخص بھی تھا، جو علاج کی غرض سے ہسپتال میں داخل تھا۔ ڈاکٹروں نے دوا کے بہانے اسے پلوٹونیم ۲۳۹ کا انجکشن لگا دیا۔ یوں اس کا جسم یکدم اس سے چھیالیس گنا زیادہ تابکاری کا شکار ہو گیا جتنا ایک عام شخص اپنی پوری زندگی میں قدرتی طور پر اس کا ہدف بنتا ہے۔ موسو ۱۹۸۴ء تک

زندہ رہا اور اس تمام عرصہ میں جلدی امراض، معدے کی خرابی اور سستی و کمزور ذہنی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، جس کے نتیجے میں وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کے بھتیجے جیرالڈ موسو نے نیوزویک کے نمائندے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ گھناؤنا فعل دوسری عالمی جنگ میں نازیوں کے جنگی جرائم سے مشابہ ہے، جن پر ان کے خلاف مقدمے چلے اور پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔

اس نے سچ کہا۔ نازی نظام بھی مادی نقطۂ نظر کا حامل نظام ہی تو تھا، جو ہر قسم کی انسانی اور اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے ہر نوعیت کے تجربات کرنے اور ان سے معلومات کے ممکنہ حصول کا شائق تھا۔ اس نے ایسے ایسے سائنسی تجربات کیے کہ جن کی تفصیلات سن کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ مثلاً دو جڑواں پیدا ہونے والے اشخاص کو آپریشن کے ذریعے نہایت احتیاط سے الگ کیا گیا۔ پھر ان میں سے ایک کو پہلے صرف چوٹیں لگائی گئیں اور بعد میں قتل کر دیا گیا، یہ جاننے کے لیے کہ اس بات کا دوسرے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ [گلبرٹ ہائیٹ نے ایسے ہی ایک موقعہ پر کہا تھا: "O science, what crimes are committed in thy name!"۔] توأم اشخاص پر اس طرح کے مختلف تجربات کے ذریعے معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا جس کے طریقۂ حصول اور استعمال کی بابت آج دنیا میں اخلاقیات کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم فاؤسٹ کے حصولِ علم و دانش کی خاطر اختیار کردہ شیطانی طریقے کو بھول جائیں یا اخلاقیات کا سبق یاد کریں!

شیورلے گاڑیوں کی کمپنی کے مالی فوائد، صدر ایزن ہاور کا ہدایت نامہ، خفیہ امریکی ایٹمی تجربات، نازیوں کے اعلانیہ و نیم اعلانیہ سائنسی تجربات، بیوی کا شیروں کی خوراک بنتے خاوند کی تصاویر اتارنا، یہ اور ان جیسے 'معمول کے' ہزارہا دیگر واقعات و حوادث، انسان اور فطرت کو بڑی مہارت سے ایک ایسے قابلِ استعمال مادی وجود میں ڈھالنے کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جس کی کوئی حرمت ہے نہ تقدس۔ یہ ہے احترامِ انسانیت کا انکار کرنے والی مادی تہذیب کی اصل و اساس جو مادے کی انسان، اس کے احساس و شعور اور ہر قسم کی اخلاقی اور علمی اقدار پر فوقیت کی قائل ہے۔ اس میں لمبائی، چوڑائی، گہرائی، کثافت اور تیزی و صلاحیت ایسے مادی خصائص پر مبنی قوانین سے ہٹ کر کوئی ایسی خاصیت یا قانون بار نہیں پا سکتا جو عقل کے مقررہ پیمانوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

مادی علمی نظام کی حقیقت

جدید مغربی علمی نظام ایک مادی و افادی اور خالص عقلی نقطۂ نظر کا حامل نظام ہے، جو آپ کو

پچھلی تمام مثالوں میں کارفرما نظر آئے گا۔ یہی نظام آج کے بیشتر علوم و معارف اور نظامہائے فکر میں چھپا ملے گا۔ ان علوم کی اصطلاحات، کلّیات و مسلّمات، مناہج و نقطہ ہائے آغاز اور ان کی تفصیلات و طریقۂ کار، سب کے سب اسی نظام سے متبادر ہیں۔ اب اگر کوئی ان اصطلاحات اور مناہج کے پوشیدہ فکری پہلوؤں سے مناسب طور پر آگاہ ہوئے بغیر انھیں اپناتا ہے، تو انجانے میں وہ اس نظام کے بنیادی نظریات اور مسلمہ جات کو قبول کر لیتا ہے۔ مغربی استعمار اور اس کی ثقافتی یلغار کی بدولت یہ علمی نظام دنیا کے دیگر تمام علمی اور فکری سانچوں سے زیادہ رائج و مستعمل ہے۔ مغربی استعمار نے ساری دنیا کو پچھاڑ کر اس پر اپنی برتری اور تسلط برقرار رکھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطوں میں تقسیم کیا۔ پھر اپنے تہذیبی نظام کو قمع و استبداد اور خود اس نظام میں سہولت و جاذبیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالوں سے یوں عام کیا کہ اب یہ نظام دنیا کے بیشتر خطوں میں ایک عالمی نظام کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا ہے، اور اسے اپنانے اور لاگو کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے مشرقی معاشروں میں دیگر ہرقسم کے تحیُّزات سے زیادہ مغرب کے اس علمی نظام کے لیے تحیُّز پایا جاتا ہے۔

اس نظام کی نمایاں خصوصیات اور ان پر مبنی مختلف ضمنی تحیُّزات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جدید مغربی مادی نظامِ فکر کا نقطۂ آغاز یہ بات قرار پائی کہ کائنات کا مرکز و محرک اس کے اندر پوشیدہ ہے، اس سے ہٹ کر یا بڑھ کر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو خدا کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں پایا جاتا، وہ فقط انسانی تخیل کی کرشمہ زائی ہے، یا اگر وہ موجود ہے تو انسانی فکر کے علمی و اخلاقی اور معنوی و جمالیاتی نظاموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیز دنیا کا مقصدِ وجود اور اس میں پائے جانے یا وقوع پذیر ہونے والے تمام مظاہر و احوال کی توجیہ خود ان کے اندر پنہاں ہے۔ مذکورہ سبھی نظام ہائے فکر اپنی بنیاد فطرت کے اِنھی احوال و مظاہر پر رکھتے ہیں اور انھی سے اپنی تجدید و تعمیر کے لیے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ گویا خالق اور مخلوق کی دوئی یکسر نظر انداز کر دی گئی۔

۲۔ پہلے پہل انسانی (humanistic) نقطۂ نظر کا ظہور ہوا ، جس کے مطابق انسان مرکزِ کائنات، اور سب (متخیل و متصور) خداؤں کا مبدأ و مآب قرار پایا۔ یورپ کی 'نشاۃِ ثانیہ کے ادب' نے اس نقطۂ نظر کے باقاعدہ وجود میں آنے کو انسانی تاریخ میں ایک یادگار لمحے کے طور پر محفوظ کیا۔ ایسا لمحہ جس میں انسان نے خود کو کائنات اور اس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کا سردار جانا۔ یہ 'یادگار لمحہ' واقعی یادگار رہتا اگر اس کی بنیاد انسان کے فطرت سے علیحدہ اور مستقل وجود پر رکھی جاتی۔ لیکن ہوا یوں کہ اسے خالص مادی بنیادوں پر استوار کیا گیا، جس سے بظاہر نظر آنے والی دوئی، عملی لحاظ سے

یکسانیت میں ڈھل گئی۔ یوں کہ ہر قسم کے مالی و تنظیمی نظامہائے کار میں اس دوئی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انسان سمیت دنیا کی ہر چیز کو احساس و شعور سے عاری محض ایک مادی وجود تصور کیا گیا اور اسی نظریے کے تحت استعمال میں لایا گیا۔

شروع ہی سے طبعی قانون، اشیاء و احوال کی منطقی توجیہ اور فکری سانچوں کے مادی اور یکساں ہونے کا علم رکھنے اور اسے عام کرنے والے (مادیین) کی آواز نمایاں رہی۔ پہلے ہوبز اور میکیاولی کا 'ظہورِ با شعور' ہوا، پھر 'عہدِ روشن' کے فلسفی 'جلوہ افروزِ محفلِ خرد' ہوئے اور انسان کو محض ایک کل یا مادی طور پر حرکت و استعمال میں آنے والا آلہ قرار دیا۔ اس کے بعد ڈارون، نطشے، اینگلز، مارکس اور فرائڈ نے علمی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا، اور آخر میں دریدا اِن 'آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو' دانشوران کے قبیلے میں آ شامل ہوا۔ سب نے پہلے مل کر انسان کے سارے جوڑ بند (structure) الگ الگ (deconstruct) کیے، پھر مادے اور طبعی اشیاء کی منطق کے موافق ان کی نئے سرے سے 'ترتیب و تدوین' کی۔ مادی نظامِ فکر ایک ایسا نظام ہے جس کے مطابق دنیا اپنے کُل کے لحاظ سے ایک ایسے باہم مربوط مادی، فطری نظام کا نام ہے جو مسلسل حالتِ حرکت میں ہے۔ یہ دنیا (کائنات کی مشینی توجیہ کے لحاظ سے) گرداں و پریشاں ذرات سے تشکیل پائی ہے، یا (نامیاتی توجیہ میں) باہم دگر پیوست اعضاء کی صورت ایک گٹھا ہوا نامیاتی وجود ہے، یا پھر ان دونوں کا مجموعہ۔ ('نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمسٹری' کی مثال سے یہ بات زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آ سکتی ہے)۔ نیز دنیا مکمل طور پر سبب اور مسبَّب یا علت و معلول کا ایک مادی سلسلہ ہے، جس میں حالات اگر ایک جیسے ہوں تو شے (الف) ہر بار لازمی طور پر شے (ب) پر جا منتج ہو گی۔

یہ دنیا باہم منسلک عناصر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں کوئی رخنہ پایا جاتا ہے نہ خلل، اور جو متوازن اور یکساں نوعیت و رفتار سے ارتقاء کے قانون کی روشنی میں محوِ سفر ہے۔ پوری کائنات ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ایک ایسے سفر پر روانہ ہے جس میں 'فطری سادگی کے وطنِ مالوف' کی جانب مراجعت ممکن نہیں۔ یہ اپنی مادی اساس کے لحاظ سے تغیر و تبدل سے دوچار ہے، اور یہ تبدیلی بغیر کسی مادی اسباب کے ظہور نہیں کر سکتی۔ انسان اور فطرت کے درمیان کوئی بڑا اور بنیادی نوعیت کا فرق نہیں پایا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس مادی، فطری دنیا کے متوازن اور یکساں نوعیت و رفتار سے پیہم چلنے والے اس نظام میں کسی رخنے یا انقطاع کا موجب بنتا۔ انسانی وجود، اس مادی، فطری دنیا کے دیگر مظاہر و احوال سے مختلف نہیں، بلکہ انھی کا ایک تسلسل ہے۔ اس پر بھی بعینہٖ وہی قوانین منطبق ہوتے ہیں جو فطرت کے بقیہ تمام مظاہر پر لاگو ہیں۔ مادی طور پر انسان، حیوان اور جمادات میں نہ صرف یہ کہ

بیشتر اقدار مشترک ہیں اور ان پر یکساں قوانین کا اطلاق ہوتا ہے، بلکہ انسانی وجود کے ذرا مختلف نوعیت کا واقع ہونے کی توجیہ بھی اس لحاظ سے کوئی مشکل بات نہیں۔ اپنی ساخت، ترکیب اور عمل کے لحاظ سے یہ طبعی مظاہر سے یقیناً مختلف واقع ہوا ہے، لیکن تجزیہ وتحلیل کے بعد آخر الامر یہ بھی فطرت میں جاری و ساری انھی قوانین کے تابع آتا ہے جو انسانی اور مذہبی یا اخلاقی نوعیت کے خارجی اہداف و اغراض سے ما ورا ہیں۔

یوں مادی قوانین کے تحت آ جانے سے انسان کا وجود اس مادی، فطری نظام کے جزوِ لاینفک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اب اسے فقط انسان نہیں، بلکہ 'مادی فطری انسان' کہنا چاہیے۔ (انسان کا لفظ شامل کرنا اس لیے ناگزیر ہوا کہ مادہ و فطرت کا غیرمنفک جز ہونے اور فطری مادی قوانین کے تابع آنے کے باوجود اس کا الگ سے کوئی شناختی نام بھی تو ہو)۔ یہ فطری مادی انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ فطری مادی نظام میں شامل اسی میں جیتا، اسی سے بنا اور اسی پر انحصار کرتا ہے۔ چڑیا گھر میں باہر سے آیا کوئی نیا جانور نہیں اور نہ خارج میں اس کی موجودگی کا کوئی پتا ملتا ہے۔ طبعی لیکن 'غیر جانبدار' اغراض سے ہٹ کر اس کا علیٰحدہ سے کوئی ہدف ہے نہ مقصد، اور نہ یہ کسی مستقل ارادے کا حامل ہے۔ یوں انسانیت (humanism) کے نقطۂ نظر نے انسان کے فطرت سے علیٰحدہ وجود کا دھوکا دے کر جو ایک دوئی بنائی تھی، اس کی حیثیت مادے اور فطرت کی دوئی جیسی نکلی۔ یعنی مادی فطری انسان اور فطرت و مادّہ کے مابین کوئی فرق نہ ہوا، اور انسان اپنی الگ حیثیت و ارادہ سے فطرت اور اس کے قوانین کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انسانی وجود کا تقدس بھی جاتا رہا، کہ اب وہ محض ایک مادی وجود تھا جس کی کوئی حرمت نہیں۔ انسانی ذات کی پر اسراریت اور اس لحاظ سے اس کی مختلف النوع منفرد خصوصیات بھی زائل ہو گئیں۔ آخر الامر اس سب ''سائنس'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کائنات میں اپنی وہ مرکزی حیثیت کھو بیٹھا جو 'humanism' نے اسے عطا کی تھی۔ اس کے برعکس، وہ میکانکی نظریے کے حوالے سے محض ایک بے وقعت ذرہ بن کر رہ گیا یا نامیاتی نقطۂ نظر سے کُل کا ایک غیر اہم جز۔

اس طرح مادی نظامِ فکر نے پہلے اشیاء کو انسان کی دنیا سے نکال کر فطرت کی دنیا میں لا کر رکھا، اس فطرت کی دنیا میں جس کے اپنے قوانین ہیں۔ پھر خود انسان کو اس کی دنیا سے کھینچ کر اشیاء کی دنیا میں لا پھینکا۔ یوں اس منطقی 'صغریٰ کبریٰ' کو ملانے سے اس پر بھی فطری دنیا کے وہی قوانین لاگو ہو گئے جن کا اطلاق اشیاء پر ہوتا ہے۔ یعنی مغرب کے جدید مادی نظامِ فکر نے 'خدا کی موت' اور انسان کو مرکزِ کائنات قرار دیے جانے کے اعلان سے آغاز کیا، اور 'انسان کی موت' اور فطرت کے حق

میں اس کی الگ حیثیت و ارادہ کے خاتمے کی منزل پر جا کر دم لیا۔ یہ ہے وہ یکساں نوعیت کی مادی ساخت والا نظام جس میں تمام مخلوقات یکساں طور پر لاگو ہونے والے ایک بے لچک مادی فطری قانون کی پیروی کرتی ہیں، اور اشیاء کی منطق انسان کی منطق پر اشیاء ہی کی طرح منطبق آتی ہے۔ اور یہ ہے مغرب کے فکری 'ترقیاتی' منصوبے کا سنگِ بنیاد جو ایک قانون، ایک ثقافت اور ایک انسانیت کو ساتھ لیے ارتقاء کے ایک اور یکساں نظام کی نمائندگی کرتا ہے، جس میں تمام مظاہر و احوال فطری نظام کے تابع مہمل اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر مغربی علم و دانش کا پورا رنگ محل تعمیر ہوا اور عملی زندگی کے لیے ترجیحات طے کی گئیں۔ اس مادی فکری نظام نے خالق و مخلوق اور فطرت و انسان کی ثنویتوں سے نکلی ہر قسم کی دوئیوں کو ختم کر دیا اور یہ پوری طرح تسلیم کر لیا گیا کہ:

ا) انسانی عقل فطرت (یعنی مادے) ہی کا حصہ ہے۔ اس میں اس بات کی پوری پوری صلاحیت ہے کہ فطرت کی معروضی اور مکمل غیرجانبداری کے ساتھ بعینہٖ اصل کے مطابق نقل اتار کر محفوظ کرتے ہوئے آگے منتقل کر سکے۔ البتہ یہ چیز اس کے بس میں نہیں کہ فطرت سے آگے بڑھ کر اپنی مستقل اور آزادانہ حیثیت کا اظہار کرے۔ فطرت ہی کے مانند عقل بھی حدود نا آشنا ہے، لیکن اس کی یہ غیرمحدودیت، انفعالی اور غیر جانبدارانہ نوعیت کی ہے۔ گویا عقل بھی انھی خصوصیات کی حامل ہے جو فطرت یا مادے اور مادی فطری انسان کی صفات ہیں۔

ب) عقل اس بات پر قادر ہے کہ فطرت اور انسانی زندگی کے سارے عام اور مشترک پہلوؤں کو اپنے حیطۂ ادراک میں لا کر محفوظ کر سکے۔ نیز حیات و کائنات کے یہ عام مادی اور فطری پہلو ہی ہیں جو تمام احوال اور مظاہر و اشیاء پر لاگو ہونے والے عام قانون کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ج) تمام حقائق عقلی لیکن حسیاتی نوعیت کے ہیں اور ان کا ان کی تمام تر جزئیات سمیت احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ حسیاتی تجربے کی سطح پر سمجھ میں آنے والی اشیاء ہی حقیقی ہیں۔ اور ان سے ہٹ کر ہر چیز وہم ہے، محض افسونِ تخیل ہے۔ یوں علم وہی ہے جو حسیاتی اور تجرباتی نوعیت کا ہو۔

د) وقت کے ساتھ ساتھ 'نا معلوم' کا دائرہ سمٹتا جائے گا، اور انسان سمیت اس مادی، فطری جہان کی جو باتیں وقتی طور پر سمجھ میں نہیں آتیں، وہ جیسے جیسے معلومات دستیاب ہوں گی، انسان کے علم میں آتی جائیں گی۔ اس طرح علم کے مسلسل بڑھنے اور 'معلوم' کا دائرہ پھیلتے جانے سے مکمل طور پر یا بڑی حد تک مادی اور انسانی فطرت پر قابو پا لیا جائے گا۔ یوں انسان اور فطرت سے متعلق ساری چیزیں مادی

اور اضافی (relative) نوعیت کی ہوئیں جنھیں معلومات کی بنیاد پر حساب و شمار میں لا کر ان کی 'پروگرامنگ' کی جا سکتی ہے۔ گویا سب جہان محض ایک قابلِ استعمال مادی وجود ہوا جس کی کوئی حرمت یا تقدس نہیں۔

ھ) عقل، انسان کو اس کے تمام مادی معاشرتی ماحول سمیت ان عام فطری قوانین کے مطابق نئے سرے سے تشکیل دے سکتی ہے جو فطرت اور اس کی اشیاء کے مطالعے سے انسان کے علم میں آئے ہیں۔ یہ عمل ترشید (rationalization) کہلاتا ہے، یعنی صورتِ واقعہ پر یکساں نوعیت کے قوانین کا اطلاق کرتے ہوئے ایک ایسا نظام وجود میں لانا جس سے عقل کو ماحول پر کامل گرفت حاصل ہو جائے۔ نیز ماحول کو مادی طور پر استعمال میں آنے والا ذریعہ بنا کر بڑے اور صلاحیت والے کام لیے جا سکیں۔

جب ہم اس علمی و فکری نظام سے متبادر اس کے اخلاقی سانچوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے یہ مادی جہان (مادی ہونے کے لحاظ سے) کسی بھی قسم کے تقدس اور (اپنی اضافی نوعیت کے باعث) کسی بھی خارجی ہدف یا مطلق و عالم گیر اقدار سے یکسر عاری ہے۔ اس کائنات سے انسان کا تعلق اور مقصد، معلومات کے حصول سے اس میں جاری و ساری قوانین کا پتا چلانا اور اسے اپنے تصرف میں لانا ہے۔ سائنسدان کا اوّلین مطمحِ نظر کُرۂ ارض اور اس پر موجود وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے فطرت پر اپنی گرفت مضبوط کرنا ہے، تاکہ یہ زمین مکمل طور پر انسان کے تسلط میں آ جائے۔ (یعنی پہلے انسان کو مادی فطرت میں شامل کرتے ہوئے فطری قوانین کا اس پر یوں اطلاق کیا گیا کہ یہ ان کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ پھر انسانی حدود سے نکال کر مادّہ و فطرت کے جہاں میں داخل کیے گئے اس انسان کو انھی فطری قوانین کے علم سے ہر قسم کی اخلاقی اقدار اور خارجی یا مطلق اہداف سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فطرت کو گرفت میں لانے کا فریضہ سونپ دیا گیا۔ یوں وہ کسی شے کی حرمت کا قائل نہ رہا۔ یہی وہ تصورِ کائنات ہے جس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ انسان عرصہ سے بھگتتا چلا آ رہا ہے(۵))۔ اب اس مقصد کے حصول کی خاطر لازم ٹھہرا کہ انسان سمیت فطرت کی ہر چیز کو علّت و معلول کے ایک ایسے محکم سلسلے میں باندھ دیا جائے جس سے قوانینِ فطرت کے تحت تمام مظاہر و احوال کی توجیہ وتعبیر کی جا سکے اور انھیں استعمال میں لانے کا طریقۂ کار بھی معلوم ہو سکے۔ یوں انسان اس زمین پر کسی بھی قسم کی ثابت و مطلق اخلاقی اور ان سے مطابقت اختیار کرتی ہوئی معاشرتی اقدار کی پیروی و نفاذ کرنے والی کسی مکرّم و محترم ہستی کا نام نہیں، بلکہ محض ایک بے حرمت مادی وجود ہے۔

ثابت و مطلق ایک طرف، دنیا میں کسی بھی اخلاقی یا معاشرتی قدر کا سرے سے کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ اگر کسی قدر کا وجود ہے تو وہ ہے فائدہ اور لذت، جس کے تحت اشیاء کا صَرف و استعمال زیادہ سے زیادہ کر کے حسیاتی لذت حاصل کی جائے اور اس غرض کے لیے پیداوار بڑھا کر مالی فوائد حاصل کیے جائیں۔ اس طرح پیداوار اور استعمال کا ایک ایسا دائرہ جاتی سلسلہ (cycle) بندھ جائے جسے نطشے نے ابدی تکرار (eternal now) کا نام دیا ہے، جو 'لایعنیت' کے ادبی تنقیدی مکتبۂ فکر (theatre of the absurd) کے مطابق (نظر بظاہر) مقصدیت سے عاری الٹی سیدھی حرکتوں پر مشتمل ایک ڈرامہ ہے، اور جو بت پرستوں کے نزدیک تاریخ کے بے معنی و مفہوم دائروں کا ایک غیرمنتہی سلسلہ۔

یہاں یہ اہم اور بنیادی بات ہمارے پیشِ نظر رہے کہ مادی نظامِ فکر تاریخی لحاظ سے مغربی سامراج کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نظام نے نظری طور پر انسان کو (جو مغربی انسان ہے) کائنات کا مرکز ٹھہرایا۔ یہ انسان ہر قسم کی حدود و قیود اور اخلاقی اقدار سے آزاد ہے۔ اس کے نزدیک طاقت ہی اصل معیار قرار پایا ہے۔ دنیا سب بنی نوعِ انسان کے لیے استعمال کے قابل ایک مشترکہ مادی شے ہونے کی بجائے فقط گورے مغربی انسان کے استعمال کے لیے بنی ہے جو اپنے علاوہ دیگر سب انسانوں کو ہیچ اور نیچ گردانتا ہے۔ انسان کسی نسلی اور علاقائی تقسیم کے بغیر کائنات کا مرکز قرار پانے کی بجائے، صرف گورا مغربی انسان اس میں مرکزی کردار کا حامل ہے۔ لہٰذا اس کے لیے لازم ٹھہرا کہ اپنی اس مرکزیت کو برقرار رکھنے کے لیے دوسروں کو ہر صورت تابعِ فرمان بنائے اور انھیں 'تہذیب' سکھائے، ایسی تہذیب جس میں کوئی مطلق نوعیت کی اخلاقی قدر نہیں پائی جاتی (اور جسے اصطلاح میں 'Anti-civilization'، یعنی 'بد تہذیبی' کا نام دیا گیا ہے)۔ یہیں سے فکر و عمل میں سامراجی نقطۂ نظر نے جنم لیا جس نے مغربی انسان کی عقلی نشوونما اور اس کا نظریۂ عالم تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس طرح سامراج کے استعماری سلسلے کا باقاعدہ آغاز ہوا، اور دنیا (یعنی انسان اور فطرت) پر مغربی انسان نے اپنا تسلط جمانے کی ٹھانی۔ چنانچہ استعمار کے لشکرِ جرّار انحاء و اقصائے عالم میں پھیل گئے۔ شمالی و جنوبی امریکا کے باشندوں (ریڈ انڈینز) کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر لاکھوں افریقی باشندوں کو بالجبر ان دو برِّ اعظموں پر لایا گیا، تاکہ تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں ان سے 'بیگار' لی جائے۔ ان میں سے کچھ تو منتقلی کے عمل کے دوران (شاید کسی 'کنٹینر' میں) ہی انتقال کر گئے۔ [اِنَّا لِلرَّجُلِ الْاَبْیَض وَ اِنَّا اِلیٰ مَآرِبِہٖ رَاجِعُوْن!]. بقیہ کی جان وہاں پہنچنے کے بعد ان کے جسم سے قطرہ قطرہ کشید کی

گئی اور ہڈیوں کا گودا تک چوس لیا گیا۔ اس کے بعد مغرب کی عسکری طاقت باقی تمام دنیا پر اپنی مرکزیت کا سکہ جمانے روانہ ہوئی اور وہاں کے اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور مقامی ثقافتی سانچے تباہ و برباد کیے۔ ایشیا کو 'ویشیا' سمجھ کر پامال کیا تو افریقہ کو 'تیرگیِ عالم' جان کر مٹانا چاہا۔ اس طرح تمام دنیا کو اپنی کالونیوں اور منڈیوں میں بدل ڈالا۔ وہیں سے خام مال اور سستا مزدور حاصل کیا اور انھیں کو اپنی مصنوعات بیچ کر نفع کمایا۔ اگر براہِ راست لشکر کشی سے اپنا قدیم عالمی نظام نافذ کیا تھا تو جدید عالمی نظام کے لیے عسکری طاقت کے ساتھ ساتھ مقامی سیاسی و ثقافتی ٹوڈیوں سے بھی پنہاں و برملا مدد لی۔

مادی فکری نظام کے تحیُّزات (تعصُّبات)

جدید مغربی فکری نظام کے سارے تحیُزات، اس کی ایک اور یکساں نوعیت والی مادی حیثیت سے پھوٹتے ہیں جس نے خالق و انسان کی اور اس پر مبنی انسان اور فطرت کی دوئی کو مٹا ڈالا۔ ان تحیُّزات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ا۔ پہلا اور سب سے اہم تحیُّز انسانی اور غیر مادی کی قیمت پر فطری اور مادی نقطۂ نظر کے لیے اختیار کیا جانے والا تحیُّز ہے۔ یہ فطرت اور اس کی مادی اشیاء کے حق میں انسان اور اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس میں ہر انسانی چیز کو فطری اور غیر انسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور انسان ضبط و قیاس اور تحکم و تسلط کا ذریعہ بننے والے ان قوانین کا اتباع کرتا نظر آتا ہے جو فطرت کے احوال و مظاہر کے مطالعے میں استعمال ہوتے ہیں۔ تمام سماجی احوال و مظاہر کو سائنسی علوم میں استعمال ہونے والے مناہج و طریقہ ہائے تحقیق کی رو سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اسے انسانی اور طبیعی علوم کی الگ الگ حیثیت و شناخت کے مقابل (وحدتِ علوم) کا نام دیا گیا ہے۔

(وحدتِ علوم) کا یہ تصور انسان اور فطرت کی دوئی کے خاتمے کی علمی و اخلاقی ترجمانی ہے۔ فہم و عمل کا یہی وہ بنیادی منہج ہے جس کے ذریعے ساری کائنات پر یکساں نوعیت کے مادی نظام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اور اشیاء کی منطق انسانی منطق پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس طرح سارا جہاں کسی بھی ہدف کو بروئے کار لانے کے لیے ایک مادی وسیلے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسے ایک ایسا مادی فطری وجود تصور کیا جاتا ہے جس پر عام اور ایک ہی طرح کے مادی قوانین منطبق ہوتے ہیں۔ شے کے یوں 'انسانی' سے 'فطری' میں ڈھل جانے سے اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور ارادی پہلو بیک نظر ساقط ہو جاتے ہیں اور کسی بھی خارجی (انسانی و اخلاقی) ہدف کے خلاف تحیُّز جنم لیتا ہے۔ گویا یہ تحیُّز

اصل میں انسانی مرتبہ و منصب کے خلاف ہوا، کہ آخر انسان ہی اس بھری پری کائنات میں وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے آزاد اِرادہ و اختیار کا مالک ہے، جو کائنات کے اس نظام میں کسی خارجی غایت یا ہدف کی کھوج رکھتا ہے اور اپنے سلوک و عمل کو مختلف اخلاقی نظاموں کا پابند بناتا ہے۔ اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ حتمی اور مطلق نوعیت کے مختلف پیمانے ایجاد کیے گئے جو کائنات، اس کے تمام مظاہر و احوال اور انسان اور مچھر تک کے سلوک و عمل کی علمی اور سائنسی انداز میں ایسی تعبیر و توجیہ کر سکیں جو آخری اور حتمی ہو۔ باقی جہاں تک انسان کے خوابوں، آرزوؤں، اس کے اخلاقی اہداف اور آزاد فیصلوں کا تعلق ہے، تو یہ باتیں علمی باتیں نہیں ہیں۔ (یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں)۔ یہ صرف ذاتی نوعیت کی، غایاتی اور کیفیاتی چیزیں ہیں جنھیں علمی نقطۂ نظر یا سائنسی طریقۂ کار سے کوئی علاقہ نہیں۔ (اگر ہے تو تجارتی نقطۂ نظر سے جس کے تحت خلوت کا 'کارِ دیگر' بھی سرِ عام لا پیش کیا جاتا ہے)۔

۲۔ دوسرا تحیُّز 'خاص' کی قیمت پر 'عام' کے لیے ہے۔ اس میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ جتنا زیادہ احوال و مظاہر کو ان کی ذاتی خصوصیات سے الگ کر کے عمومی سطح پر لایا جائے گا، علمیت اور قطعیت اسی قدر زیادہ ہو گی۔ انسانی منصب اور کسی غایت و ہدف سے اشیاء کی یہ علٰیحدگی (تجرید) انھیں علمی اور عالمی حیثیت عطا کر دے گی، جس سے وہ تمام رخنے اور دوئیاں مٹ جائیں گی جو اشیاء کی انفرادی خصوصیات نے فطرت کے نظام میں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس سطح پر پہنچ کر ہمارے لیے ایک ایسے عام مادی اور فطری قانون کا استخراج ممکن ہو سکے گا جو 'انسانی' کو 'فطری' سے جوڑتا ہے اور جس میں تمام انسانی مظاہر و احوال مادّہ و فطرت کے قوانین کی رو سے 'یک قالب و یک جان' ہو جاتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس تحیُّز کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی مظہر و حال کی خاص وضع، اس کی خصوصیت و انفرادیت، یعنی اس کا 'تعین و تنزل' یا اس کی خاص اور منفرد حیثیت، اس کے علمی اور سائنسی مطالعے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے، اور عام فطری قوانین تک رسائی کے لیے بروئے کار لائے جانے والے تجرید کے عمل کو سست کر دینے کا باعث بنتی ہے۔

۳۔ ایک تحیُّز قیاس و فہم میں آ سکنے والی کمّیتی اور محسوس و محدود شے کے لیے فہم و ادراک میں نہ آنے والی کیفیتی اور نا محسوس و لا محدود شے کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مغربی علوم نے مظاہر و احوال کے مطالعے کو اشیاء کی فقط محسوس دنیا میں محصور کر دیا۔ یوں تمام لامحدود، کیفیاتی اور محسوس و نا محسوس

سے مرکب اشیاء و احوال کا مطالعہ، مادی تجزیہ و تحلیل کے نمونوں کی روشنی میں یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ انھیں مغرب نے اپنے 'قرونِ وسطی کے توہمات' کا حصہ قرار دے کر علم کی تعریف سے خارج کر دیا۔ جس چیز کو خارجی طور پر جانچنا ممکن نہ ہو، اسے علمی مطالعے کا موضوع بنانا جہالت و حماقت قرار پایا۔ معلوم و محسوس مادی دنیا پر خارج سے اثر انداز ہونے والی نا محسوس اشیاء کا جدید علمی خطوط پر جائزہ لینا اور تجربہ و ادراک میں لا کر کمّیتی طور پر انھیں وصف و شمار میں لانا اور ان کی تعبیر و تشریح کرنا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں۔ یوں جس چیز کو قیاس و فہم میں نہ لایا جا سکے ، کمّیتی طور پر اور 'غیرجانبدارانہ' انداز میں اس کے حصے بخرے نہ کیے جا سکیں (جیسے ما بعدالطبیعیاتی اور اخلاقی و غایاتی عناصر)، تو ایسی چیز کا شمار ثانوی اور غیر اہم امور میں ہو گا۔ چنانچہ اسے نظر انداز کرنا ہی بہتر اور (آگے بڑھنے کے لیے) ضروری قرار پایا۔

۴۔ چوتھا تحیُّز مرکب و کثیر اور غیر ہم آہنگ کے مقابل، سادہ و یکساں نوعیت والے ہم آہنگ عنصر کے لیے ہے۔ اس تحیُّز میں سادہ قسم کے مظاہر و احوال کو مطالعے کا موضوع بنا کر ان کی سادہ انداز میں توجیہ و تعبیر کی جاتی ہے، اور ایک پورے مظہر یا حال کو ایک قاعدے یا زیادہ سے زیادہ دو 'تغیرپذیر حالتوں' میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ انسانی سلوک و عمل کی تعبیر و توجیہ سادہ نوعیت کی مثالوں اور نمونوں کے موافق یوں کی جاتی ہے کہ ایک علت و سبب والا مظہر و حال، وحدتِ علوم اور سادہ و یکساں نوعیت والے مادی نظام کا نمائندہ قرار پاتا ہے۔ اس نظام کے تحت تمام کائنات کی مرکزی وحدت اور اس کے تمام مظاہر و احوال کے پیچھے کارفرما ایک ایسے مطلق و ہمہ گیر، لیکن 'غیرجانبدار' اور لادینی و 'غیر اخلاقی' (secular) کلیے کی تلاش عرصہ سے جاری ہے جو ہر چیز کا مبداً و مآب اور مصدر و مرجع ہو؛ کائنات اسی ایک سبب اور قانون سے متحرک و قائم رہتی ہو؛ اور وہی ایک قاعدہ انسان سمیت ساری مخلوقات و اشیاء اور ان کے عارض و ثابت احوال کی تسلی بخش توجیہ و تعبیر کر سکے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ 'اقتصادی تغیر پذیری کا قانون' ہی وہ بنیادی کلیاتی اصول ہے جو کم از کم انسانی دنیا میں کارفرما ہے۔ اس کی مختلف شکلیں اور نام ہیں۔ بینتھم کے نزدیک اسے مادی منفعت کا نام دیا جاتا ہے۔ آدم سمتھ اسے دولت کا ارتکاز اور منافع کا حصول کہتا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کے حامل مفکرین کے ہاں یہ پیداواری ذرائع میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ تاہم کبھی یہ دولت اور منفعت سے ہٹ کر دوسرے محرک عناصر کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا ہے، جیسے فرائڈ کے خیال میں جنسی جذبہ، کارلائل کے نظریے میں شہسواری و بہادری، نازیوں کے مطابق آریائی نسل کی برتری کا احساس، اور صہیونی اعتقاد کے لحاظ سے ارضِ موعود کا حصول۔

یکساں نوعیت کے نظام سے متبادر علت و غایت اور قاعدہ و اصول کی یہ وحدت و یکسانیت، دوسرے اور مختلف نوعیت کے قوانین اور سانچوں کے قطعی انکار پر مبنی ہے، اور مشترکہ انسانیت کے اس تصور کی نمائندگی کرتی ہے جس کے مطابق کسی قسم کا اختلاف یا تنوع قطعاً نا جائز ہے۔

۵۔ پانچواں تحیُّز ذاتی (subjective) کے مقابلے پر معروضی کے لیے ہے۔ یہاں معروضیت (Objectivity) سے مراد تحقیق کار کو اپنی ذات اور ہمہ قسم کے انسانی میلانات سے علیٰحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنا ذہن کورے کاغذ کی صفت بالکل صاف اور خالی بنا لینا ہے۔ اس کے بعد 'سلولائیڈ فیتے' کے مانند حقائق کو تمام تر جزئیات سمیت، کامل انفعالیت اور 'غیر جانبداری' سے یوں اس پر منتقل کرنا ہے کہ مطالعے کا موضوع کوئی مظہر یا حال محض ایک شے کی حیثیت اختیار لے۔ یہ معروضیت پھیل، کر انسان سمیت، تمام اشیاء کا احاطہ کرنا چاہتی ہے، تاکہ خود انسانی وجود اور اس سے متعلق مختلف احوال و مظاہر بھی جب مطالعے کا موضوع بنیں تو تحقیق پرداز انھیں بھی فطرت کی دیگر اشیاء کے مانند، داخلی عوامل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، مکمل غیر جانبداری اور سرد مہری کے ساتھ فقط خارج سے نظر آنے والی شکل و صورت کے لحاظ سے جانچ پرکھ سکے اور ان سے مادی فطری قوانین کا استخراج کر سکے۔ اس طرح تمام انسانی مظاہر و احوال کی جامع، حتمی اور 'غیر جانبدارانہ' توجیہ ممکن ہو سکے گی۔ تاہم سبب و اصول کی یہ وحدانیت، باہم متقابل و نقیض قطبین کے درمیان، کبھی ایک انتہا کو چھوتی کبھی دوسری تک پہنچتی، ڈولتی جھولتی سفر کرتی ہے۔ یعنی ایک طرف منہج و طریقۂ کار میں کامل معروضیت اور اسے بروئے کار لانے میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا اور دوسری جانب ان سادہ و عام قوانین کا پتا لگانے کی کوشش کرنا جو مطلق اقدار اور کائنات کی جامع انداز پر توجیہ کرنے والی کسی بھی 'علتِ غائی' سے معرّا ہوں۔ یوں کائنات کی وہ مادی، عقلی توجیہ تلاش کی جاتی ہے جس سے ہر چیز علت و معلول اور تسلسل و دوام کے ایک ایسے محکم سلسلے میں بندھ جائے جو کسی رخنے یا توقف سے نا آشنا ہو۔ اس طرح کی کوئی بھی کوشش، ظاہر بات ہے، کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی، خاص طور پر جبکہ موضوعِ مطالعہ خود انسان ہو۔ چنانچہ اس قسم کی تحقیق میں اکثر و بیشتر بجائے معروضیت کے ذاتیت در آتی ہے، اور کبھی تو اول سے آخر تک ذاتی رجحانات ہی غالب رہتے ہیں۔ مزید برآں، یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ احوال و مظاہر میں تسلسل کی جگہ انقطاع پایا جاتا ہے، جس کے سبب عام اور سادہ نوعیت کے قوانین تک رسائی ممکن نہیں۔ اس طرح انسان 'جدیدیت' اور 'روشن خیالی' کی عقلی مادیت سے 'مابعدِ جدیدیت' کی تیرہ فکری اور 'لایعنیت' والی مادیت تک جا پہنچتا ہے۔ متناقض قطبین کے درمیان سفر

کی یہی کیفیت جدید مغربی تہذیب کی بنیادی خصوصیت ہے۔

واضح رہے کہ یہ ڈول جھول اس تہذیبی نظام میں قطبین کی ایک ایک متضاد و متقابل شے کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جانب اگر انسان، عقل اور کامل تسلط کی فکر لاحق ہے تو دوسری طرف فطرت، لاعقلیت اور مکمل آزادی و آزادہ روی کے ساتھ گریز کا رویہ بھی آ شامل ہوتا ہے۔

ہدفیت، انفرادیت اور ذاتی و ترکیبی خصوصیات کے خلاف یہ تحیُّز دراصل انسانی صفات کے خلاف مادی و فطری خصوصیات کے حق میں اختیار کیا گیا۔ یعنی انسان اور فطرت کی دوئی کو ختم کرتے ہوئے اول کو ثانی الذکر کے تابع کر دیا گیا۔ مادی علمی نظام کے دیگر تحیُّزات کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے جو سب کے سب 'فطری' کے حق میں 'انسانی' کے خلاف تحیُّز ہی سے پھوٹے ہیں۔ چنانچہ سکون وتحمل اور نرم روی (کی انسانی صفات) کے مقابل تشدد و بے کلی اور تندی و تیزی (والے مشینی رویے) کو پسند کیا گیا۔ کائنات کے بے رخنہ و جوڑ(۶) اور تسلسل و یکسانیت سے رواں دواں ہونے کے تصور کو انقطاع و اختلاف کے قائل نظریے کے مقابلے میں اختیار کیا گیا۔ نیز مکمل دائرے اور خطِ مستقیم کو 'منحنی یا پیچیدہ' اور 'مکمل یا ناقص دائرَوی' شکلوں پر ترجیح دی گئی۔

۶۔ اگلا انسان مخالف تحیُّز اصطلاحات کے ایک خاص نظام کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے تحت اصطلاح وہی بہتر اور مناسب تر ہے جو عام ہو، کامل انطباق کی صلاحیت رکھتی ہو، بیانیہ اور کمّیتی ہو اور مجازی معنی اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر کسی انسانی مظہر و حال پر اطلاق کے لیے ایسی اصطلاحات اختیار کی جاتی ہیں جو فطرت میں پائی جانے والی اشیاء کی صفات ہوں۔ یہ تحیُّز مبہم و غامض کے مقابل پورا پورا منطبق آنے والے واضح اور ریاضیاتی اندازِ نظر کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ سارے کے سارے علوم جزوی باریکی اور کامل انطباق کے حامل ہوں۔ ان میں تمام مطالب و مباحث اس طرح باہم مربوط ہوں کہ کسی قسم کے خلل کا احساس نہ ہو۔ ('آزاد تلازمۂ خیال' کی انسانی صفت کو قطعاً پسند نہیں کیا جاتا)۔ اسی لیے الجبرا کی زبان مثالی زبان سمجھی جاتی ہے، جس میں دال اور مدلول یا اسم اور مسمّٰی کے مابین، یا اشارہ و علامت اور معنی و مشار الیہ کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل نہیں ہوتی جو مطلب سمجھنے یا نتیجے تک پہنچنے میں روک بنے۔ اس میں (الف) اور (ب) کا مطلب (الف) اور (ب) ہی ہے، اور ان کا تعلق اگر (ج) ہے تو (ج) ہی ہوگا، (د) نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر انسانی علوم میں ریاضی کی مثالوں سے کافی مدد لی گئی، کیونکہ ریاضی کی مثال ایک ایسی تصور کردہ شکل یا علامت ہوتی ہے جو صورتِ واقعہ کی

پوری پوری کمّیتی اور حسابی نمائندگی کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں، اس میں یہ صلاحیت بھی ہوتی ہے کہ متعلقہ صورتِ حال میں پیش آمدہ مختلف ضمنی احوال و عوارض اور ان میں کمی بیشی کو جوں کا توں بیان کر سکے، ان کی تعبیر و تشریح کر سکے اور کسی ممکنہ صورت کا اندازہ بھی لگا سکے۔ چنانچہ یہ خیال زور پکڑ گیا کہ مرکب و پیچیدہ تر صورتِ حال کی ہندسوں اور ریاضی کی مساواتوں میں بخوبی ترجمانی کی جا سکتی ہے۔

کسی مظہر و حال کے خارجی کمّیتی خد و خال کا مطالعہ کرنے کی خاطر، تحقیق کار اس مقصد کے لیے وضع کردہ ان مختلف وسائل کا سہارا لیتا ہے جو ظاہری اور کمّیاتی عناصر کے تجزیہ و تحلیل اور جانچ پرکھ میں مدد دے سکیں۔ ان میں سروے فارم، گوشوارے، اعداد و شمار میں کمی بیشی کو ظاہر کرنے والے گراف اور ریاضی کی مختلف علامات اور مساوات و کلیہ جات شامل ہیں۔ یہ تمام تحقیقی ذرائع متعلقہ مظہر و حال کے نامیاتی کل کو پورے طور پر تجزیہ و تحلیل کے عمل سے گزار کر ان علمی و سائنسی نتائج تک پہنچاتے ہیں جو ابتدائی اور جزوی عناصر کی کانٹ چھانٹ کر کے داخلی کیفیاتی اختلاف کو فقط ظاہری اور کمّیتی نوعیت کی امتیازی خصوصیت کے طور پر ظاہر کرے۔

۷۔ تعریفات میں اس بات کا تقاضا کرنا کہ وہ جامع و مانع ہوں اور پوری وضاحت و باریکی کے ساتھ کامل انطباق کی صلاحیت رکھتی ہوں، حقیقت میں مغربی اصطلاحات اپنانے کا تحیُّز ہے۔ جدید مغربی نظام خود کو ایک ایسے واحد علمی نظام کی صورت میں ظاہر کرتا ہے جو اپنے خصائص، خط و خال اور مناہج و ذرائع کے لحاظ سے مکمل اور خود مکتفی ہو۔ اس تصور کو سہارا دینے کے لیے مختلف تحقیقی، سیاسی، ثقافتی اور عسکری نوعیت کی تنظیموں اور اداروں کا ایک ایسا جال بچھا دیا گیا جس کے تحت کسی بھی بات، افواہ یا نظریے کو کامیاب، علمی اور 'مصدقہ اطلاع' کے طور پر پھیلانے، نیز 'غیر پسندیدہ' معلومات کو ٹھکانے لگانے کا کام انجام دیا جا سکے۔ یہ نظام، تشکیل کے ہنوز ابتدائی مراحل میں سانس لینے والے ان علمی و تحقیقی منصوبوں کے خلاف ہے جو اپنی بنیاد مغربی نظریات و افکار پر نہیں استوار نہیں کرتے...... ان منصوبوں میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا منصوبہ بھی شامل ہے جو خارجی قالب کی کسی حد تک الگ پہچان رکھنے کے باوجود ہمارے نئے معاصر ماحول میں ٹھوس نظری مباحث کے لحاظ سے ابھی تک غیر واضح اور نا مکمل ہے، عمل اور اطلاق کا کام تو یقیناً بعد میں ہوتا ہے۔ تہذیبی شکست و ریخت کے بعد یہ وہ صورتِ حال ہے جس میں ہم مشرق کے بوجھ بجھکڑ اپنی تہذیب کی تجدید کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ادھر مغرب میں بھی اپنے موجودہ غیر انسانی تہذیبی نظام سے برگشتہ و نالاں چند مفکرین کی احتجاجی آواز ہماری فکر اور ارادے کو سہارا دیتی نظر آتی ہے، لیکن خود اُسے سہارا دینے اور ایک مکمل

فکری نظام کی شکل میں پیش کرنے کے لیے کوئی مضبوط تنظیمی ڈھانچہ اور اپنے نظریات کا علمی سطح پر دفاع کرنے کے لیے مناسب تحقیقی ادارے دستیاب نہیں...... بہر کیف، پوری پوری وضاحت اور کامل انطباق کی صلاحیت والی جامع مانع تعریفات اور مکمل ظاہری وصف و بیان کرنے والی تحقیقات کے خبط نے خواہی نخواہی مغرب کی اصطلاحات اور مفاہیم اپنانے اور وہیں سے نمونے کے سانچے اور نقطہ ہائے نظر مستعار لینے کا راستہ دکھایا۔ مغرب کے اس نظامِ فکر میں اشیاء کے باہم ارتباط اور اصطلاحات کے وضع و اطلاق کی خاطر ضروری قرار پایا کہ ابہام (جو ترکیب اور تناقض کے فرق کی طرح غموض سے ہٹ کر ہے) کسی قدر گوارا کر لیا جائے۔ نیز یہ بھی لازم ٹھہرا کہ عملی طور پر کام دے سکنے والی بعض تعریفات اور ابتدائی طور پر توجیہ مہیا کرنے والے فرضیات بھی اختیار کر لیے جائیں۔

۸۔ مغرب کے مادی علمی نظام کا ایک اور تحیُّز کسی تسلسل میں انقطاع پذیری، مقصدیت اور انفرادی مادی خصوصیات کے خلاف دوام و استمرار، مادی وحدانیت، بے مقصدیت اور ریاضیاتی زبان کی خاطر ہے۔ اس تحیُّز کی اصل غرض و غایت 'ماحول پر کامل سامراجی تسلط' حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ جس چیز یا جن چیزوں پر مادی وحدانیت کے قانون کا اطلاق کیا جا سکے (یعنی جن پر فطرت و اشیاء کے مطالعے سے انسان کے علم میں آئے عام فطری قوانین لاگو کرنا ممکن ہو اور یوں ان کی 'ترشید' یا 'rationalization' ہو سکے)، انھیں تخفیف و تسہیل کے عمل سے گزار کر ایک نظام کی شکل میں سبب اور مسبب کے سادہ و محکم سلسلے میں پرو دیا جائے۔ تاہم جس شے کو مختصر کر کے اس کی سادہ انداز پر تعبیر و تشریح ممکن نہ ہو، اسے ثانوی حیثیت دیتے ہوئے (غیر فطری)، (غیر اہم)، (پراگندہ و منتشر) اور (یہ تحقیق کے قابل نہیں) ایسے عنوانات دے کر الگ کر دیا جاتا ہے۔

مادی ترقی یا (تحیُّزِ اکبر)

آج کل ہر فرد بشر ایک ہی کلمہ پڑھتا، ایک ہی وظیفہ کرتا نظر آتا ہے۔ سب کے حرزِ جان ایک ہی بات اور زبان پر ایک ہی ورد جاری ہے: ترقی، ترقی، ترقی...... ترقی ہی سب کا مقصد و مطمحِ نظر ہے۔ ترقی ہی کے لیے یہ ساری تجدید اور تجدد پسندی کی بساط جمائی جاتی ہے؛ ترقی ہی کی خاطر سارے پیداواری اور تعمیری منصوبوں کا بکھیڑا کیا جاتا ہے؛ ترقی ہی کے مسحور کن و نشاط آور راگ کی تان میں بدمست ہو کر سماجی و سیاسی نظریات اور انقلابات کی حکمتِ عملی بروئے کار لائی جاتی ہے؛ اور ترقی ہی کے اسمِ اعظم کی تکرار میں سب سَم سموں کے کھلنے کا راز پوشیدہ نظر آتا ہے۔ دمنہور کے قدیم مصری شہر کے کسی کوچے میں گلّی ڈنڈا کھیلتے بچے سے پوچھیں یا امریکا کے جدید میڈل ٹاؤن شہر

کے کسی گراؤنڈ میں ڈنڈ پیلتے نوجوان سے؛ طنطا کے کسی چوک پر سڑک پار کرتی بڑھیا سے دریافت کریں یا نیویارک کی کسی شارعِ عام پر گاڑی چلاتے ٹیکسی ڈرائیور سے، سب یہی کہتے نظر آئیں گے کہ ہمیں ترقی کرنا ہے، اور ترقی کرنا ہے، اور زیادہ ترقی کرنا ہے۔ ترقی ہی ہے جو ہماری فلاح ونجات کا ذریعہ ہے، ترقی کے بغیر ہم موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔

باقی کو چھوڑیے، میرے ساتھ آیئے، مَیں آپ کو دمنہور لیے چلتا ہوں جہاں میں نے اپنا بچپن اور نو عمری کے دن گزارے۔ سب کا اس بات پر اتفاق بلکہ 'اجماع' ہے کہ دمنہور شہر نے بڑی ترقی کی ہے۔ وہاں ٹیلی فون استعمال کرنے والوں کی تعداد دیکھیے، سڑکوں کی لمبائی چوڑائی پر نظر ڈالیے، گاڑیوں کی تعداد کو شمار قطار میں لایئے، ایک شخص کے استعمال میں آنے والی لحمیات کا وزن کیجیے، زندگی کے بہتے ریلے کی رفتار کا جائزہ لیجیے، سب کی سب باتیں ایک ہی بات کی علامت، ایک ہی چیز کی جانب اشارہ کرتی نظر آتی ہیں کہ دمنہور شہر نے بڑی ترقی کی ہے۔ یقیناً.... بالکل... بے شبہہ و شک .... انکار کی کوئی وجہ نہیں.... لیکن.... لیکن ذرا ٹھہریے۔ ابھی چوک میں سرخ بتی جل رہی ہے۔ آیئے، اس دوران مَیں آپ کو چشمِ تصور سے اپنے پرانے زمانے کے پس ماندہ دمنہور قصبے کی تھوڑی سی سیر دکھا دوں۔

زمانۂ طفولیت میں ہم سب بچے سہ پہر کے وقت گھروں سے نکلتے۔ ہم میں سے فنکارانہ صلاحیت والے کاغذ کے خوبصورت رنگ دار جہاز بناتے جو ہم فضا میں چھوڑتے تو صاف نیلے آسمان میں (آسمان اس وقت نیلا ہوا کرتا تھا) وہ تیرتے نظر آتے۔ ہماری مائیں پرانے کپڑوں سے چھوٹی چھوٹی گیندیں بنا کر دیتیں اور ہم ان سے کھیلتے۔ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر امیر اور غریب کے بچوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ سب مل کر کاغذ کے جہازوں اور کپڑے کی گیندوں سے کھیلا کرتے۔ کم از کم کھیل کے دوران ہم سب طبقاتی اور معاشرتی فرقِ مراتب سے خاص طور پر آزاد ہو کر اتحاد و یگانگت کے رنگ میں رنگے نظر آتے۔

اور اب . . . . اب کھیل کا وقت دمنہور میں طبقاتی کشمکش کے عروج کا وقت ہوتا ہے۔ غریب کا بچہ ابھی تک کپڑے کی گیند اور کاغذ کے جہاز بنا کر کھیلتا ہے، جو بیٹری سے چلنے والے کھلونوں کے 'ظہور' کے بعد یکدم اپنی حیثیت کھو بیٹھے ہیں۔ جبکہ نئے کھلونے سارا کھیل خود کھیل کر دکھاتے ہیں اور بچے کو کم ہی شرکت کا موقع دیتے ہیں۔ انسان ایک انفعالی اور تاثر پذیر شے بن کر رہ گیا ہے۔ (ایسے تو حیوان کا بچہ بھی نہیں ہوتا)۔ اپنے ماحول کو نئے نظام کے مطابق ڈھالنے (یعنی 'ترشید' یا

'rationalization') اور ترقی کا تناسب بڑھنے سے 'وڈیو اور کمپیوٹر گیمز' کی 'بعثت' ہوئی، جو کھیل کے میدان میں ترقی کا اگلا قدم ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات میل جول کم کرنے اور گرد و پیش کے سارے ماحول کو اجنبیانے اور یوں ایک بھرے پرے دیس کو پردیس بنا دینے کا باعث بھی بنی۔ اکیلے ایک صمٌ بکمٌ یا مسلسل ایک جیسی کی آواز دینے والے آلے کے سامنے بیٹھے رہو، جو مقررہ پروگرام کے موافق بڑی صلاحیت کے ساتھ طے شدہ نتیجے تک پہنچا دے گا۔ خوشی نہ غمی، نہ رونا نہ ہنسنا، نہ سننا نہ بولنا، کسی قسم کا کوئی احساس یا ردِّعمل نہیں۔ ایسے کھیل اور کھلونے جو انسان سے اس کی انسانیت سلب کر لیں، کیونکر رواج پا گئے؟ انسان، اُنس سے ہے، جو اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے مانوس ہو، کلوں اور مشینوں سے نہیں۔

ہم نفَسو! اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل، مہر و وفا کو کیا ہوا؟!)(۷)

میرے زمانۂ طفولیت میں دمنہور کے اندر 'ٹینشن' کم کم ہی کسی کے اعصاب پر سواری کا شوق کیا کرتی تھی۔ سہ پہر کے وقت زیادہ تر لوگ فارغ ہوتے۔ یوں ان کے لیے ملنا جلنا، دکھ سکھ میں شریک ہونا اور ایک دوسرے کے کام آنا بسہولت ممکن تھا۔ اب دیکھیے تو پریشانی اور تناؤ کی کیفیت ہر شخص کے چہرے پر لکھی، خط و خال کا حصہ بنی نظر آئے گی۔ کیا اس کا سبب محض فراغت کی کمی ہے یا زمین اور آسمان اور خشکی اور تری میں پھیلی آلودگی؟ کہیں یہ اس روایتی گھر کی بنیادیں ہل جانے (یا 'خشتِ اول' کی طرح ٹیڑھی ہو جانے) کی وجہ سے تو نہیں جو اطمینان و سکون کا گہوارہ ہوا کرتا تھا؟ یا اس کا کارن دن رات نہ رکنے والی ٹریفک کا وہ شور ہے جو کانوں کے پردے پھاڑ کر دماغ میں گھسا جا رہا ہے؟ وہ خوبصورت باغ کیا ہوئے جو دمنہور کی زینت تھے۔ حديقة المنتزه کے بیشتر حصے پر کنکریٹ کی تہیں چڑھ گئیں۔ حديقة الاسماك کی رنگ برنگی چمکتی مچھلیاں شاید الف لیلہ کے جادوئی تالاب میں واپس چلی گئیں، اور جاتے وقت باغ بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ حديقة النادی کو ایک 'فلنگ اسٹیشن' نے کھا لیا۔ مشتل کا ذخیرہ، جس میں بہت سے نادر الوجود درخت تھے، اسے زمیں کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ (اور 'تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا' کہ) اسکول سے واپسی پر مَیں اس کے پاس سے گزرتا، اور وہاں رک کر کھجور کی شکل کا ایک کھٹا میٹھا میوہ توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ سب کی سب چیزوں کو ترقی کھا گئی۔ ہم اب دھواں کھائیں یا خاک پھانکیں!...... شام کو ہم لوگ گھر کے صحن یا چھت پر بیٹھ کر اپنی اپنی یاد کردہ نظمیں سناتے یا عجیب و غریب مخلوق والی الف لیلائی کہانیاں سنتے تھے، اور اپنے اپنے حصے کی شرارتیں بھی کیا کرتے۔ اس طرح سب افراد باہم

اپنائیت کے احساس سے سرشار تھے۔ نابینا نور محمد، جو سال بھر پنجسورے اور مذہبی قصوں کی کتابیں بیچتا اور رمضان میں سحری کے وقت جگانے بھی آیا کرتا، اپنی میٹھی دلنشیں آواز میں گنگناتا اور ہمیں قصے کہانیاں بھی سناتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اس اونٹ کا قصہ سنایا جو قصاب سے بھاگ کر رسولِ خداؐ کے پاس پناہ لینے آیا۔ تب سے اونٹ میرے احساس و وجدان میں ایک خاص علامت بن کر بیٹھ گیا۔ (دین، مذہب سے 'رومانوی وابستگی' ابھی باقی تھی)۔ عشرۂ اخیرہ میں وہ بڑے لحن کے ساتھ.....(الوداع اے ماہِ رمضاں، الوداع!)..... پڑھتا ہوا گزرتا۔ میں ابھی چھوٹا تھا۔ میری ماں مجھے سحری سے ذرا پہلے جگا دیتی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتا۔ نور محمد باری باری سب کے نام پکارتا۔ میں اپنا نام سن کر کھڑکی بند کرتا اور واپس اپنے بستر میں گھس کر پھر سے ٹوٹے سپنے کی کڑیاں جوڑنا شروع کر دیتا۔

یہاں خواب و انقلاب اور حالات کو سنوارنے کی آرزو تک سے محروم کوئی اشتراکی یا سرمایہ دار حقیقت نگار یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مَیں رومانوی خواب دیکھنے والا کوئی سودائی ہوں۔ مَیں اسی ترقی کر جانے والے دمنہور شہر میں بسنے والے 'غریب غربا' کی صورت نظر آنے والی پسی ہوئی انسان نما مخلوق کی زندگی کے مصائب و آلام اور ان کی شقی بختی و تنگ حالی سے بخوبی واقف ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ انسان کے من میں کیا کیا خباثتیں اور 'آفاق گیر شرور' چھپے ہوئے ہیں، کہ جنھیں محض مادی ترقی کا دھوکا نہیں مٹا سکتا۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ دمنہور کبھی جنت نظیر نہیں رہا، لیکن یہ بھی درست ہے کہ حالات کی نئی کروٹ کی زد میں آ کر انسان کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بگڑ گئی ہے۔ تو آیئے!..... بجائے 'گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑانے' یا حالات کا رونا رو کر اپنے دکھڑے سنانے کے، کیوں نہ ہم سوچ بچار کا ڈول ڈالیں، قلم پکڑیں اور اس کی نوک سے ذہنوں پر ایک عرصہ کے جمے ہوئے زنگ کو کھرچ ڈالیں۔ آیئے!..... اجتہاد کا در وا کریں۔ آیئے!..... دیکھیں کہ ترقی کا معنی و مفہوم اور اس کی اصل و اساس کیا ہے؟ یہ کے بھاؤ ملتی ہے، اس کے ثمرات کس رنگ اور ذائقے کے حامل ہیں اور یہ کونسی چیز کے ساتھ کھائی جاتی ہے؟

آؤ، پرکھیں 'علم' کے اوہام کو
'فقہِ جانبدار' کی باتیں کریں)(۸)

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ترقی کا یہ مخصوص تصور مغرب کے جدید مادی نظامِ فکر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہر اس کلی نوعیت کے سوال کا جواب ہے جس کا جلد یا بدیر ہر انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مَیں کون ہوں؟ اس کائنات میں میرے وجود کا مقصد کیا ہے؟ اسلامی

نقطۂ نظر سے 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' یا مغرب کے انسانی (humanistic) نقطۂ نظر کے مطابق اپنی ذات اور حقیقت کی پہچان، نیز خیر کے کام کرنا اور شر سے بچنا ہے؟ یا ہمارا مقصدِ وجود پیداوار و صَرف، خرید و فروخت اور لذت و منفعت کا حصول ہے؟ جدید مغربی تہذیب نے ترقی کے مؤخر الذکر مفہوم کو پہلے اور آخری ہدف کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ اس کے مطابق ترقی واضح اور مادی خصوصیات کی حامل، معین نقطۂ ہائے فکر سے اپنا آغاز و استناد کرتی ہے۔

الف) ترقی کا مفہوم مادہ و فطرت سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ترقی فطرت کے مقررہ قوانین کی طرح ایک حتمی عمل قرار پایا ہے جو افراد کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوصف اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور کوئی اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔

ب) ترقی ایک ایسا عالمی سفر ہے جو خطِ مستقیم پر ایک ہی سمت میں جاری رہتا ہے، اور ہر شعبہ و میدان اور ہر زمان و مکان میں تسلسل و دوام کے ساتھ فطرت کے ایک اور یکساں قانون کی پیروی کرتا ہے۔

ج) ترقی کی تعریف میں یکساں نوعیت کی حامل انسانی تاریخ کا مفہوم شامل ہے۔ اس کی رو سے مشترک انسانیت کا ظہور، تاریخ و تہذیب کے مختلف سانچوں کی صورت میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو بات ایک تہذیبی نظام پر منطبق آئے، اسے تمام تہذیبوں اور ان کی تاریخ پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کو ہم (تاریخی وحدت الوجود) کا نام دیں گے۔

د) کبھی ترقی یکے بعد دیگرے آنے والے مختلف ارتقائی مراحل کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو اپنی تفصیلات میں یقیناً مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن آخر الامر وہ ایک ہی مقصد یا ہدف پر جا منتج ہوتے ہیں۔

ھ) مغربی معاشرے، خاص طور پر یورپ کا مغربی حصہ اس 'فطری عالمی ترقی' کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ (گو ترقی، مشترکہ تاریخ کے جبر سے، معراج حاصل ہونے کے بعد بھی جاری رہتی ہے)۔ لہٰذا اس 'خاص مغرب' اور اس کے 'امریکی خلف الرشید' کی تقلید لازم ہے۔

و) ترقی، علم کے اس تصور سے استناد کرتی ہے جس کے تحت معلومات تسلسل کے ساتھ بڑھتی اور اکٹھی ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ز) علم کے بڑھنے اور معلومات کے جمع ہونے سے انسان کا ماحول پر تسلط بھی بڑھ جاتا ہے۔

ح) دنیا میں قدرتی وسائل لا محدود ہیں۔

ط) انسانی عقل بھی لا محدود ہے، جس کی وجہ سے ترقی بھی لا محدود اور غیر منتہی حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں ہمیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ مذکورہ صدر افکار میں سے بیشتر کی کمزوری یا یکسر غلط ہونا علمی سطح پر ثابت ہو چکا ہے۔ مغربی نظامِ فکر کے مطابق اس کائنات میں انسان کا مقصدِ وجود ترقی اور محض ترقی حاصل کرنا ہے، ایسی ترقی جو منفعت اور لذت کے گرد گھومتی ہے۔ تاہم اگر ذرا سا غور کریں تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ:

ا) ترقی کے اس عمل کا، مادے اور فطرت کے مانند، کوئی مقررہ انسانی ہدف ہے نہ کوئی معینہ اخلاقی مفہوم۔ چنانچہ فطرت اور مادے کے تسلسل میں ترقی بھی ایک غیر مختتم عمل، ایک نہ رکنے والا سفر ہے۔ معروف انسانی مفہوم میں ترقی، عام طور پر، کسی چیز یا ہدف کی جانب ایک سے دوسری جگہ تک کا سفر ہے، لیکن مغرب کے مادی مفہوم میں ترقی حرکت کا ایک ایسا عمل ہے جس میں بغیر کسی مقررہ ہدف کے منتقلی کا سفر جاری رہتا ہے۔

ب) اس طرح پر ترقی کا کوئی حوالہ و مرجع یا مبداٗ و مآب نہیں ہوتا۔ اس کا حوالہ اور ہدف خود اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وسیلہ خود مقصد ہے یا وسیلہ اور مقصد دونوں ایک ہی ہیں، یعنی ترقی۔ ہم اس لیے ترقی کرتے ہیں کہ ہم مزید ترقی کریں، اور زیادہ ترقی کریں، کیونکہ ترقی ایک بے اندازہ و نہایت، غیر انقطاع پذیر عمل ہے۔ (طلبم نہایتے آں کہ نہایتے ندارد)۔ گویا ترقی حتمی ہی نہیں، آخری بھی ہے۔

ج) لیکن یہ حرکی و استمراری ترقی غیر جانبدار اور کسی غرض کی آلودگی سے پاک نہیں(۹)۔ بلکہ ترقی کے مغربی مفہوم کے مطابق اس میں مادی نقطۂ نظر کی حامل پوری پوری جانبداری یا تحیُّز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یوں، آخرِ کار میں ترقی کا پیمانہ یہ قرار پاتا ہے کہ (پیداوار و صَرف اور خرید و فروخت کے لحاظ سے) لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لیے زیادہ سے زیادہ منفعت اور لذت کا حصول ممکن ہو۔ 'فطری انسان' ہی اصل انسان ہے، جس کی عام اور مادی نوعیت کی فطری ضروریات و حوائج ہوتے ہیں۔ فطری ضروریات والا یہ فطری انسان سامراجی نقطۂ نظر سے مغرب کا سفید فام انسان ہے، (ایشیا کا 'سفید پوش' یا افریقا کا سیاہ فام اس تعریف سے خارج ہے)۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت اور مادے کے قوانین کی صورت ترقی بھی دینی، نسلی اور اخلاقی نوعیت کے روایتی، تہذیبی خصائص و اقدار کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتی۔ ترقی کے پیمانے زیادہ تر سادہ اور عام نوعیت کے مادی پیمانے ہوتے ہیں کہ ٹیلی فونوں کی تعداد کتنی ہے، لحمیات کتنی مقدار میں استعمال ہوتی ہیں، گاڑیوں کی تعداد اور رفتار کتنی

ہے، سڑکوں کا طول و عرض کتنا ہے، نیز لوگوں کی مصروفیت اور آنا جانا، سفر کرنا کس قدر ہے۔ ان باتوں کا تناسب جتنا زیادہ ہو گا، اسی حساب سے ترقی بھی زیادہ ہو گی۔ عام طور پر ترقی ماپنے کے یہ پیمانے، فہم و قیاس میں آ سکنے والی اشیاء پر لاگو ہوتے ہیں۔ جس شے کو ماپنا اور پرکھنا ممکن نہ ہو وہ ترقی کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ اب اس زاویۂ نظر کے تحت گرد و پیش کو مکمل طور پر اپنے تصرف میں لانے کے لیے ایسے صنعتی نظام کی تشکیل عمل میں آئی جو اپنی پیداوار کا فقط مادی پیمانوں سے اندازہ لگائے اور ماحول سے ہم آہنگی اور معنوی اقدار کو یکسر نظر انداز کر دے۔

عام فطری قانون کے لحاظ سے ترقی کا یہ مادی تصور، جس کے معیار پر صرف مغرب پورا اترتا ہے، مغرب ہی کی برتری کو تسلیم کرانے اور اس کی ہمہ گیریت کے تصور کو فروغ دینے کا باعث بنی۔ اس طرح مغرب کا علمی و تہذیبی نظام ہی تمام نوعِ انسانی کے لیے 'واحد معیاری نظام' قرار پایا، اور اس کی پیروی پوری غیرمغربی دنیا کے لیے لازم ٹھہری، تاکہ اس کے اور مغرب کے درمیان حائل عدم ہم آہنگی کی وسیع و عریض خلیج کو پاٹا جا سکے، اور یوں ترقی کی سربلندی اس کے نصیب میں آئے۔ بصورتِ دیگر دنیا پس ماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر (بلکہ اتار) دی جائے گی۔ ترقی کے اس تصور کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید مغربی اقدار، روایات، اہداف اور تجربہ و مہارت کا، بلاتخصیص و استثناء، ساری دنیا پر اطلاق کیا جانے لگا۔ مختلف علوم، خاص طور پر سماجی علوم میں مغربی مفاہیم و نظریات، اپنے اپنے معاشرے اور تہذیبی سانچوں کی انفرادی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے منطبق کیے جانے لگے۔ اس طور پر مغربی نظام کے اتباع سے انسانی نوعیت کے ذاتی و خاص تجربات اور دوسرے کی الگ حیثیت و اہمیت کا انکار لازم ٹھہرا۔ علم و تہذیب کی تاریخ میں نہ صرف یہ کہ دوسرے کا ذکر مناسب نہیں سمجھا گیا، بلکہ سرے سے دنیا میں اس کے وجود ہی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یورپ کے مغربی حصے اور شمالی امریکا کے علاوہ باقی دنیا، غیر مغربی اور انسان کی تعریف سے خارج قرار پائی۔ یوں اس پر واجب ہوا کہ مغربی نظام اور اس کے مقرر کردہ معیارات کو مدِّنظر رکھ کر اپنا جائزہ لے اور اسی کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرے، تاکہ اس کا اعتراف بھی کیا جائے اور وہ تاریخِ عالم میں بھی بار پا سکے۔

ایک عرب ملک کی 'سول ایوی ایشن اتھارٹی' کے سربراہ کو مَیں نے بڑے واضح 'علمی' انداز میں اس 'روشن خیالی' کا مظاہرہ کرتے سنا کہ لوگوں کا سفر کرنے کا تناسب ترقی پر دلالت کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب اتنا یا اتنا ہے، جو ہمارے سفر کے تناسب سے تھوڑا ہی زیادہ ہے۔ ان شاء اللہ ہم عنقریب ان کے جتنے تناسب کا ہدف حاصل کر لیں گے۔ ترقی کی خاطر دوسرے فکری

نظام ہائے کار کی اس کورانہ و احمقانہ تقلید کے تحت شُہدوں ایسے انداز میں 'ٹیکنالوجی کی منتقلی' عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس ترقی کی ہم کیا قیمت ادا کرنے جا رہے ہیں اور آیا یہ ٹیکنالوجی ہمارے ماحول اور تہذیب و ثقافت سے لگّا بھی کھاتی ہے یا محض دوسرے کا منہ سرخ دیکھ کر ہم نے اپنے منہ پر طمانچے لگانا شروع کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر نہیں رکھی جاتی کہ ٹیکنالوجی محض مشینوں اور تنصیبات کا نام نہیں، بلکہ اس پیداواری اور تخلیقی صلاحیت کا نام ہے جو ایک طرف ذرائع پیداوار میں تبدیلی کا موجب بنتی ہے اور دوسری جانب حقیقی انسانی ضروریات پوری کرنے کو وسائل کی ماحول سے مطابقت بھی پیدا کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی میں ان باتوں کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ترقی کا مغربی مفہوم نہ صرف یہ کہ ہماری سماجی، ماحولیاتی اور اخلاقی و نفسیاتی اقدار کو ملیامیٹ کر دیتا ہے، بلکہ ترقی کا اصل مفہوم بھی خبط ہو کر رہ جاتا ہے اور نرا مسخرہ پن اور شُہدہ جاتی انداز سارے ماحول اور چہروں پر سجا نظر آتا ہے۔ ہماری (مجموعی قومی پیداوار) عام طور پر ترقی کے مغربی مفہوم کی نمائندگی کرتی ہے جو مغرب کے تحیُّزات اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ (معیارِ زندگی)، (قومی آمدنی) وغیرہ سب مفاہیم ترقی اور پیداوار کے اسی مفہوم سے متبادر ہیں۔

وقت کا اب یہ حقیقی تقاضا ہے کہ ترقی کے لیے ادا کردہ قیمت کو حساب و شمار میں لا کر دیکھا جائے؟ ترقی کا حاصل وصول اور فوائد تو واضح طور پر دیکھے پرکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس کی قیمت غیر محسوس اور بالواسطہ طور پر ادا ہوتی ہے، جسے بآسانی قیاس و شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ ترقی کے ثمرات، اس کی قیمت کے ساتھ الجھے گتھے ہوتے ہیں، بعینہٖ روایتی اقدار کے پھل اور قیمت کی طرح۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ترقی کی نشاندہ علامات میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی جائے اور اصل صورتِ حال کو پوری طرح جاننے اور سمجھنے کی خاطر ذرا دیر کو انھیں معکوس حالت میں لا کر دیکھا جائے۔ کیفیت کو کمّیت جان کر کیفیتی تبدیلیوں کا کمّیتی اثر جانچا جائے، تاکہ فکر و عمل کے مختلف منفی رجحانات اور سماجی مظاہر و احوال میں مضرت رساں عناصر کا جائزہ لیا جا سکے۔ منشیات کی لعنت؛ اباحیت پسندی (ذرائع کے پیداواری اخراجات اور صَرف و استعمال کی معنوی قیمت)؛ احساس و شعور میں کسی قسم کا کوئی اضافہ یا گہرائی پیدا کرنے سے عاری فضول قسم کی مصنوعات؛ خاندان ایسے مفید سماجی ادارے کی تباہی؛ عمر رسیدہ افراد سے ناروا سلوک؛ مصروفیات کے باعث بیوی بچوں کے ساتھ کم سے کم وقت گزارنا؛ کمپیوٹر کے استعمال سے براہِ راست میل جول میں کمی؛ فشارِ خون کی بڑھتی، اعصابی تناؤ اور ذہنی انتشار ایسے جسمانی و نفسیاتی امراض؛ گرد و پیش سے اجنبیت اور تنہائی کا روز افزوں

احساس؛ ترقی یافتہ معاشروں میں تشدد اور جرائم کا بڑھتا ہوا رجحان؛ نطشے اور ڈارون کے زیرِ اثر ایک طرف نیستی یا عدمیت اور دوسری جانب طاقت اور 'بقائے اصلح' والے نقطۂ نظر کے حامل فلسفوں کی مقبولیت؛ 'مابعدِ جدیدیت' کے اس دور میں ماحول کو نہ سمجھ سکنے کا فزوں تر احساس؛ اسلحے اور فوجی ساز و سامان پر بڑھتے ہوئے اخراجات (انسانی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ بھوک مٹانے کے لیے کھانے اور تن ڈھانپنے کو درکار کپڑے سے زیادہ اسلحے اور تباہی کے سامان پر خرچہ اٹھایا گیا)؛ میگاٹن بموں کے ذریعے پوری دنیا کو چند ثانیے میں یا ماحولیاتی آلودگی سے تدریجی طور پر تباہ کر دینے کی صلاحیت؛ سیاحت اور بڑھتے ہوئے بین الاقوامی سفر کے رجحان کا مختلف معاشروں کے مربوط داخلی ماحول اور تہذیبی اقدار پر منفی اثر۔ ضروری ہے کہ ان تمام نقصان دہ اور منفی رجحانات و مظاہر کا جائزہ لیتے ہوئے کیفیتی کو کمّیتی میں تحویل کر کے یہ دیکھا جائے کہ ان کی کیا اور کتنی معنوی اور مادی قیمت ادا کرنا پڑی۔ مثال کے طور پر خاندان اور گھر کی بنیادیں ہل جانے سے بچوں کی گھریلو تربیت پر توجہ نہیں دی جا سکتی، جس سے ان کی نفسیاتی صحت بھی متاثر ہوئی اور تعلیم پر بھی شروع ہی سے بے تحاشا خرچہ اٹھنے لگا۔ نیز بچوں میں تہذیبی اقدار سے بے گانگی پروان چڑھی اور وہ شوخی اور شوخ چشمی میں تمیز کرنا نہ سیکھ سکے۔ ترقی اور تجدد پسندی کی پروردہ جنسی آزادی سے ایڈز ایسے موذی مرض نمودار ہوئے۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ جنسی تعلقات کے حوالے سے اب عالمی سطح پر خاص احتیاطی تدابیر اپنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اباحیت پسندی کے رجحان کو ختم کرنے اور جنسی رابطہ فقط زوجین کے مابین محدود رکھنے، یا بجائے داشتائیں پالنے کے ایک سے زائد عورتیں روایتی یا قانونی لحاظ سے اپنانے (polygamy) پر کسی نے توجہ نہیں دی، بلکہ اسے خوب مطعون کیا گیا)۔

اگر ہم خوش بختی اور سکون و اطمینان کے تناسب کو ترقی کے پیمانے کے طور پر استعمال کریں تو میرے خیال میں بہت مناسب ہو گا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سعادت و اطمینان ایک اضافی اور متبدل چیز ہے جسے فہم و قیاس میں لانا ممکن نہیں، جبکہ ترقی ایک محسوس و مشہود شے کا نام ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطمینان و خوش بختی اور ترقی ایک دوسرے کی نقیض یا مختلف نوعیت و اثر کی حامل چیزیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بتایئے کہ ترقی نے انسان کو کیا شے مہیا کی؟ لمحاتی مادی آسودگی یا انسانی حوالہ؟ یہاں پہنچ کر ترقی اپنے اصل مادی چہرے سے نقاب الٹ دیتی ہے اور ہم اطمینان و سعادت کی انسانی دنیا سے نکل کر اشیاء کی پیداوار اور صَرف و استعمال والی دنیا میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اشیاء کی یہ دنیا اپنے خاص معیارات رکھتی ہے جس میں سعادت و شقاوت کو ترقی کا پیمانہ نہیں بنایا جاتا۔

اشیاء کی یہ خالص مادی دنیا بھی انسان اور ماحول کے لیے بے شمار مسائل پیدا کیے ہوئے ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ سائنسی صنعتی ترقی کے بالمقابل مَیں یہاں (کائناتی پس ماندگی) کا تصور آپ کے سامنے پیش کروں جو بہت سے تحقیقی مطالعہ جات میں پنہاں ایک نیا مضمون ہے۔ مغرب اپنی نشاۃِ ثانیہ کے دور سے لے کر کچھ عرصہ قبل تک سائنسی صنعتی ترقی اور اس کے ثمرات پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے نہیں تھکتا تھا۔ لیکن اب آ کر اسے اور ہمیں بھی پتا چلا ہے کہ صنعتی ترقی، تمام کرۂ ارضی اور خاص طور پر اس کے قدرتی وسائل پر انتہائی منفی اثرات کی حامل رہی ہے۔ ابتدا میں یہ بات 'غیب' کے اندر پوشیدہ تھی، مگر اب سارا جہان اس راز سے واقف ہو چکا ہے۔ یہ منفی اثرات اور تباہی جو ماحول اور زمین کے گرد ہوا کے غلاف پر نازل ہوئی (نازل کیا؟ اسی صنعتی ترقی سے اس نے صعود کیا)، یہی وہ 'کائناتی پس ماندگی' ہے جو ترقی کے لیے مادی سطح پر ادا کی جانے والی اور مسلسل ادا کی جانے والی قیمت ہے۔ چنانچہ حساب کتاب اور عددی شمار برابر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صنعتی ترقی اور کائناتی پس ماندگی ہر دو کے تناسب کا باہم موازنہ کر کے دیکھیں کہ حضرتِ انسان فائدے میں رہے یا خسارے سے دوچار ہونا پڑا، اور کس قدر۔ اس سلسلے میں افسوسناک بات یہ ہے کہ صنعتی ترقی نے فائدہ صرف مغرب کو پہنچایا اور اس کے منفی اثرات ساری دنیا کو بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ گویا مغربی انسان کے حق میں اور باقی دنیا کے خلاف سارے کرۂ ارضی پر ایک طرح کا 'سامراجی تسلط' قائم ہو چکا ہے۔ ترقی کے عوض ماحول کو لاحق ہونے والے مختلف نوعیت کے اسقام و عوارض کا جائزہ لینا اب ہمارے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف قسم کی صنعتی گیسوں سے اوزون کی حفاظتی تہ میں شگاف پڑ گئے، جس سے سورج کی نقصان دہ شعائیں بھی زمین تک پہنچیں اور فضا کی گرمی بھی روز بروز بڑھنے لگی۔ صنعتی بقایا جات نے سمندروں، دریاؤں کو ان میں بسنے والی مخلوق اور خود انسان کے لیے زہریلا کر دیا۔ ایٹمی فضلہ جات مسلسل تابکاری پھیلا رہے ہیں۔ فضائی آلودگی نے ہوا کو شکار کیا اور پرندے انسانوں پر آ گرے۔ ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھتی چلی گئی اور انسان نے پرندوں کی طرح پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔ مادی صنعتی ترقی کے سود و زیاں کا حساب ان چیزوں کا شمار کیے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کی زراعت و غذا سے متعلق تنظیم نے کیڑے مار زرعی ادویات کے استعمال کو ترقی کی علامت قرار دیے جانے کا جب تحقیقی جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ان کا ماحولیاتی اور غذائی نقصان، ان سے حاصل ہونے والے فوری اقتصادی منافع سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ زرعی ادویات کا استعمال بند کر دینے کا مشورہ دیا گیا، اور یوں ترقی کی علامت قرار پانے کے بعد اب ان کا استعمال تنزلی کا نمائندہ بن گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اگر کسی صنعتی منصوبے کا

انسانی اور ماحولیاتی نقصانات نکال کر حساب لگایا جائے تو دنیا کے لیے وہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔ مغرب کے صنعتی منصوبہ جات کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس کے ثمرات کی قیمت دوسرے ادا کرتے ہیں۔ کچھ دیگر ممالک نے اگر مغربی ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کا کسی حد تک کامیاب تجربہ کیا بھی ہے، تو اس کے ساتھ ہی (کائناتی پس ماندگی) والی تباہی کی خبریں بھی تسلسل و تواتر کے ساتھ اخبارات کی زینت بننے لگی ہیں۔

اس 'کائناتی پس ماندگی' کو دیکھتے ہوئے مقامی اور عالمی سطح پر سبزہ و ہریالی اور شجر کاری و تحفظِ ذخیرہ جات، نیز (دوامی پیداوار) کے تصور کو فروغ ملا۔ دوامی پیداوار یا sustainable growth سے مراد ایسی پیداوار ہے جو قدرتی وسائل کو تباہ و برباد نہیں کرتی، بلکہ انھیں برقرار رکھنے اور نقصان سے بچاتے ہوئے استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ گویا اس تصور کے حاملین، نہ صرف ترقی کے نام پر ادا کی جانے والی ماحولیاتی قیمت سے اچھی طرح آگاہ ہیں، بلکہ آئندہ نسلوں کو (کائناتی پس ماندگی) سے بچانے کی فکر بھی ان کے دامن گیر ہے۔ خدا کرے کہ یہ مبارک آغاز انسانیت کے لیے سعادت و اطمینان کا پیغام ثابت ہو اور صنعتوں کی ایسی شکل بھی سامنے آ سکے جس سے انسان اور ماحول کم سے کم تکلیف اور نقصان کا شکار ہوں۔

کچھ دیگر تحیّزات

ا۔ ڈارون اور نطشے کے نظریات

ترقی، سیکولر انسان کی فکری اور عملی زندگی پر حاوی کلیہ جاتی انداز کی مختلف اقدار کی صورت میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان میں (جہد للبقاء)، (بقاء للاصلح) اور (انسانوں کے مابین 'گرگ آشتی' کا تعلق ہے) ایسی اقدار شامل ہیں۔ کمزور کے موقف کو رد کرنا، قوی کی پذیرائی اور اقویٰ (سوپر مین) کی پرستش بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ یہ تمام اقدار مغرب کے اس مادی فلسفے سے پھوٹی ہیں جو ڈارون اور نطشے کے نظریات کی شکل میں اپنی معراج کو پہنچا۔ ان فلسفیانہ نظریات کے مطابق انسان کی دنیا مادے اور فطرت کی دنیا ہے۔ نیز مقابلہ و پیکار کے نقطۂ نظر کی حامل جسمانی اور طبیعیاتی مادی اقدار ہی فطرت اور انسان یا دشت اور تہذیب کی ہر دو دنیاؤں پر حکمران ہیں۔ ارتقاء کا واحد ذریعہ تا مرگ پیہم، بے رحمانہ جنگ ہے۔ انسان اور فطرت دونوں کے لیے واحد حوالہ و مرجع طاقت ہے جو اپنے نظام ہائے علم و اخلاق آپ تشکیل دیتی ہے۔

۲۔ فیکٹری اور منڈی

مادی فلسفے کا نمائندہ ڈارون اور نطشے کا مذکورہ زاویۂ نگاہ اپنا اظہار مادہ و فطرت کی نمائندگی کرنے والے ایک ایسے بنیادی استعارے کی شکل میں کرتا ہے جس کے تحت ساری دنیا بس منڈی اور فیکٹری کے درمیان چکر لگاتی نظر آتی ہے۔ 'منڈی اور فیکٹری' کا یہ نظریہ، یکساں نوعیت کے مادی نظام سے متبادر ہے جس میں ہر چیز قابلِ استعمال مادی وجود کی حیثیت رکھتی ہے؛ یہ دنیا مادے اور فطرت کے مانند ایک مشین کی طرح متحرک ہے؛ اور مقصدِ وجود ہر چیز پر تسلط حاصل کرنا اور اسے استعمال میں لانا ہے۔ مادی فطرت کو تسخیر کر کے خام مال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور انسانی فطرت پر قابو پا کر اس سے پیداواری طاقت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح صنعتی پیداوار عمل میں آتی ہے، جسے فیکٹری سے بازار میں پہنچایا جاتا ہے جہاں انسان (پیداواری طاقت کے بعد اب) خریداری طاقت بن کر اسے خریدتا اور صَرف و استعمال میں لاتا ہے۔ فیکٹری اور بازار کی یہ ساری گہما گہمی ایک ایسی دنیا اور انسان کا وجودفرض میں لاتی ہے جو قطعی نوعیت کے ان قوانین پر عمل پیرا ہے جن کے تحت سب لوگ بھیڑیوں کے مانند ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے، اپنے لگے بندھے معمول اور بظاہر مصالحانہ طرزِ عمل کے باوصف، ڈارون کے جنگل کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ تجارتی انسان طلب و رسد کے قوانین اور پروپیگنڈا کے ہتھکنڈوں کو بروئے کار لا کر صَرف کے لیے پیداوار بڑھاتا ہے اور پیداوار کے لیے صَرف۔ اس سارے عمل کے دوران وہ خالص اپنے فائدے اور مصلحت ہی کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور اسی کے لیے ساری کوششیں اور توانائی صرف کرتا ہے۔ وہ کسی بھی قسم کے ثابت و مطلق فکری اصولوں یا اخلاقی ضوابط سے ماورا ہو کر دوسروں کے ساتھ مسابقت کی جنگ میں مصروف رہتا ہے۔ مادے اور فطرت ہی کی طرح 'فیکٹری اور بازار' بھی ایک باہم منسلک و مربوط ، یکساں حرکت کے ساتھ پیہم رواں دواں ایک ایسا قافلہ ہے جو تمام انسانی اہداف اور اخلاقی حدود کو پیچھے چھوڑتا، (کارِ جہاں دراز ہے) کا نغمہ الاپتا ترقی کی اگلی سے اگلی منزلوں کو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ (نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں)۔ ترقی کے اس ناقرارآشنا، پیہم رواں کارواں میں کوئی یہ خیال نہیں کرتا کہ کون پیچھے رہ گیا یا گر کر کچلا گیا۔

ہے رخش، سبک سیر بہت، عمرِ رواں کا
گر جائے کوئی شے تو اٹھانا نہیں ملتا)(۱۰)

۳۔ مرکزی حکومت / ریاست

مغربی فکری نظام سے متبادر اہم اور بڑے تحیُّزات میں ایک تحیُّز یہ بھی ہے کہ خاص طرز کی ایک مرکزی قومی و لادینی (سیکولر) ریاست تشکیل دی جائے۔ یہ تحیُّز 'عملِ ترشید' (ماحول پر فطری مادی قوانین کے ذریعے غلبہ پانا)، ترقی، سائنسی معلوماتی تسلط اور (انسانی اور طبعی علوم کی دوئی کے مقابل) 'وحدتِ علوم' ایسے تصورات و مفاہیم سے منسلک اور ان پر مبنی ہے۔ وحدتِ علوم اور عقل کی اس صلاحیت پر یقین کے ساتھ ساتھ کہ وہ معلومات کو ایک جگہ اکٹھا کر سکتی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ انسان کے علم میں آنے والے فطری قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے صورتِ واقعہ کو نئے سرے سے ترتیب دے سکتی ہے، یہ خیال بھی پروان چڑھا کہ انسانی معاشروں کو یکساں قوانین کے مطابق چلانے اور ان کی 'ترشید' (rationalization) کرنے میں سائنس بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہ ہدف حاصل کرنے کے لیے ریاست (یا مرکزی حکومت) کے تصور کو ایک بڑے اور 'واحد ذریعۂ کار' کے طور پر سامنے لایا گیا۔ ایسا ذریعہ جو مختلف جامع منصوبہ جات پر عمل پیرا ہو کر ماحول کو یکساں بنانے اور اس میں پائے جانے والے تمام مظاہر و احوال کو تخفیف کے عمل سے گزار کر کمّیتی حیثیت دیتے ہوئے اس کی ترتیب و تنظیمِ نو کرنے پر قادر ہے۔ ماحول پر تسلط پانے اور اسے اپنے مقصد کی خاطر استعمال میں لانے کے لیے ریاست معاشرے کی تمام نسلی اور مقامی خصوصیات کو نہ صرف نظر انداز بلکہ سرے سے ختم کر دینے کے درپے ہو جاتی ہے، تاکہ ایسی سماجی زیریں ساخت تشکیل دی جا سکے جو انسانی اور مادی ہر دو سطح پر تمام تر اہداف کو پورا کر سکے۔ مادی سطح پر، ایک ہی طرح کی اشیاء بنانے اور فروخت کرنے کے لیے فیکٹری اور منڈی کی یکسانیت، ہر سمت سڑکوں کی تعمیر اور 'قیاس و شمار کے پیمانوں کی وحدانیت' عمل میں لائی جاتی ہے۔ جہاں تک انسانی سطح کا تعلق ہے تو جدید خطوط پر تربیت یافتہ، مختلف شعبہ ہائے کار میں تخصص یا درک رکھنے والی 'مرکزی بیوروکریسی' تشکیل دی جاتی ہے جو معاشرے کے تمام افراد کے لیے یکساں نوعیت کی ہدایات اور احکام جاری کرتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے پچھلے تعلقات اور وفاداریاں ختم کر کے صرف اور صرف ریاست کے وفادار شہری بن سکیں۔ مرکزی ریاست کا یہ وفادار شہری، 'فطری اقتصادی انسان' کی حیثیت رکھتا ہے، جو یک پہلو اور سطحی ہونے کے باعث سبب اور مسبَّب کے سادہ و یکساں نوعیت والے پیٹرن کے چوکھٹے میں بآسانی پورا آ جائے، (ورنہ 'چھیلنے چھانٹنے اور کھینچا تانی کے عمل' سے گزارنا پڑے گا جو فریقین، یعنی ریاست اور فرد، ہر دو کے لیے پریشانی کا موجب بھی ہو گا اور نقصان کا باعث بھی)۔ 'مرکزی ریاست' دراصل

'مادّہ و فطرت' اور 'واحد و یکساں مادی نظام' ہی کا دوسرا نام ہے، جس میں انسان اور فطرت کی دوئی یکسر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نیز معمولات کی یکسانیت اور ایک ہی طرح کے مادی فطری قانون کے تحت مدام حرکت میں رہنا، معاشرے سے اس کی تازگی و زندہ دلی چھین کر اسے مقررہ پروگرام کے مطابق چلنے والے ایک ایسے بڑے آلے میں تبدیل کر دیتا ہے جو بنیادی 'مرکزی حکمتِ عملی' کے تحت عام اور ایک سے قوانین و منصوبہ جات پر عمل پیرا ہو۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ریاست خاندان اور باہم مربوط گروہوں یا جماعتوں ایسی چھوٹی اکائیوں کے مقابلے میں بڑی اکائیوں سے تعلق استوار کرنے اور انھی کے ذریعے معاملات طے کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ گویا خاندان اور گروہ کے خلاف تحیُّز (تعصُّب) ہوا، اور اسی نقطۂ نظر کے تحت بیوروکریسی کے نظام سے چلنے والے پبلک (عوامی) ادارے معاشرے کی داخلی تنظیمی روایات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یا انھیں جانے اور سمجھے بغیر اپنا فرض بجا لاتے ہیں۔ یوں ذاتی زندگی کے حساب پر 'پبلک لائف' کے لیے تحیُّز اختیار کیا جاتا ہے، جس میں اتفاق و سلوک اور رواداری و ہم آہنگی کی بجائے معاہدات کی رو سے معاملات کو سنوارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلکہ بعض سطحوں پر، فرد کے ضمیر کا کردار بھی ریاست اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اگرچہ اس سارے عمل کے دوران، تجزیہ و تحلیل کی خاطر ریاست فرد کو بطور اکائی (یونٹ) استعمال میں لاتی ہے، لیکن یہ فرد کسی خاندان، سماجی تنظیم یا مذہبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ ایک وفادار شہری اور 'فطری مادی انسان' ہوتا ہے جس کی شناخت کا ذریعہ بازار یا ریاست کا کوئی پبلک (عوامی) ادارہ جیسے اسکول، کالج، ٹیلیوژن، یا پھر اعلانات و اشتہارات ہوا کرتے ہیں۔ اس طرح فرد کی اپنے ان سماجی اداروں سے علیٰحدگی جو فرد اور ریاست کے مابین رابطے کا کردار ادا کرتے ہیں، فرد کو ریاست اور اس کے اداروں کے تسلط میں لے آتی ہے، اور وہ جو اور جیسے چاہیں اس سے کام لیں۔

۴۔ صَرف و استعمال کی عالمی تہذیب

'عالمی نظام' اور صَرف و استعمال کے اس آخری مرحلے میں مغرب کے مادی فکری نظام کا سب سے اہم اور خطرناک مظہر (جدید عالمی مادی تہذیب) ہے جو اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے مغربی (یا امریکی) ہو سکتی ہے، لیکن اس کی تمام تر صورتیں کسی بھی تعلق، رنگ و بو اور ذائقے سے عاری ہونے کے باعث (غیر جانبدار) ہوتی ہیں اور فطری انسان یا مادّہ و فطرت کی آئینہ دار۔ یہ عالمی نوعیت کی تہذیب اپنی معینہ ساخت کی اشیاء سے پہچانی جاتی ہے۔ 'ہیمبرگر' ہے تو محض کھانے کی چیز،

لیکن ایک خاص نوعیت کا کھانا ہے جسے ہر علاقے اور کسی بھی وقت کے لیے ایک ہی طریقہ و ترکیب سے بنایا جاتا ہے، اور اس میں کسی قسم کے تنوع یا اپچ کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسا کھانا ہے جو انسان اکیلے میں بیٹھے، یا چلتے پھرتے بھی کھا سکتا ہے، بالکل 'فطری انسان' کی طرح۔ 'بلیوجینز' ایک خاص طرز کی پتلون ہے۔ یہ نیلے رنگ کے ایک موٹے ترپال نما کپڑے سے بنتی ہے اور زیادہ مناسب ہے کہ رائج فیشن کے لحاظ سے گھٹنوں کے قریب ذرا سی پھٹی ہوئی ہو۔ یہ پتلون بڑی عملی اہمیت کی حامل ہے اور اسے بلا تخصیص ہر موقعہ پر پہنا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک 'ٹی شرٹ' بھی ہوتی ہے، جس پر کبھی کوئی اعلان لکھا ہوتا ہے کہ (پیپسی پیو اور جیو)، یا اپنی شناخت کا 'نام نہاد اظہار' کہ (میں وطن سے بہت پیار کرتا ہوں)، یا کسی 'نظریے اور موقف' کا ابلاغ کہ (میں سرخ و سپید رنگت پسند کرتا ہوں)، وغیرہ۔ ان اعلانات سے قطعِ نظر، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسان کو چلتی پھرتی جگہ یا شے بنا دیا گیا۔ ایک ظاہری شے جس کا باطن بھی ویسا ہی ہے۔ ایسی انسان نما شے جس کے قلب وضمیر کی گہرائیاں پایاب ہو کر سطح سے جھلکنے لگی ہوں۔ ان چیزوں کے ساتھ ہم ڈسکو یا پاپ میوزک اور 'نجا یا ریمبو مگرمچھ' بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں اصل کے اعتبار سے امریکی ہیں، لیکن لگتا ہے اس سے علیٰحدہ ہو کر اپنا خاص تشخص بنا لیا ہے، یا شاید امریکی تہذیب نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ اس نے یورپی نہاد و نژاد ہونے کی بنا پر اپنی ذاتی خصوصیات خود سب کے لیے عام کر دی ہیں(۱۱)۔ یوں وہ مادے اور فطرت والے اس آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں مادی فطری انسان کا ظہورِ عمل میں آیا، جس کے کوئی خط و خال ہیں نہ رنگ اور بو، اور جس کی پہچان محض حرکت، قوت، تشدد اور صَرفی صلاحیت ہے، جو انسان اور حیوان کی مشترک خصوصیات ہیں۔

اس تہذیب کی خطرناکی کا اندازہ اس بات لگایا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کے من میں چھپی وہ طفلانہ خواہش کھینچ کر سامنے لے آتی ہے جو حدود و قیود کو پھلانگتے، اپنی انسانی اور ماحولیاتی پہچان کو ترک کرتے ہوئے بقیہ ہر قسم کے نظامہائے فکر وعمل سے بیروں ہو کر انسان کو 'مادرِ فطرت کے مادی نظام' کی گود میں جا بٹھاتی ہے؛ بدیں طور کہ انسان 'اختلاف و تصادم، ارادہ و اختیار اور اخلاق و تہذیب کے رفعت آغوش جہان' کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر کچے دھاگے سے بندھا، قانونِ جاذبیت کے موافق، سیدھا 'ارضِ فطرت کے عالمِ سفلی' میں جا پہنچے۔ وہاں وہ ہیمبرگر کھائے، ٹی شرٹ اور بلیو جینز پہنے، نجا اور ریمبو مگرمچھوں کے خواب دیکھے، لیکن اس کا سر کسی بھی ارادی و اختیاری یا مرکب و پیچیدہ صورتِ حال کی زد میں آ کر 'درد آشنا' نہ ہونے پائے۔ یہ جدید صَرفی تہذیب، صِرف مشرقی تہذیبوں ہی کی مقابل و مخاصم نہیں، بلکہ خود اصیل مغربی تہذیب بھی اس کی ستم رانیوں کا شکار

بنی۔ نیز یہ کسی بھی ایسی تہذیب کی مخالف ہے جو انسانی خصوصیات کی حامل ہو اور مادے کی سطح سے بلند ہو کر، فطرت سے ترفع اختیار کرتے ہوئے، وقتی اور لمحاتی تبدیلیوں کی زد سے آزاد ہو کر سامنے آئے۔

حوالہ جات

(۱) عبارت کا اسلوب اس شعر پر بنی ہے:

گفتگو کسی سے ہو، تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلّم کا

شاید اس کی وجہ ہمارے مشرق کے 'مخصوص روحانی مزاج' کے مقابل (یا اس کی تکمیل کرنے والا) اطالوی قوم کا 'خاص رومانوی مزاج' ہو۔ افسانہ اور ڈرامہ نگار اشفاق احمد وفات پا گئے، ورنہ ان کے 'رومانوی صوفی مزاج' کے حوالے سے ہم معلوم کر سکتے کہ اس سلسلے میں ان پر قیامِ اٹلی کے دوران کیا 'رومانی، روحانی' اثر ہوا کہ جس کے بعد موصوف نے 'دانشِ مشرق' کو 'اللہ لوک بابا حضرات' میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ [مترجم]

(۲) منیر نیازی کا قولِ بلیغ ہے:

چمن میں رنگِ بہار اترا، تو میں نے دیکھا
نظر سے دل کا غبار اترا، تو میں نے دیکھا
(اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا، تو میں نے دیکھا)

(۳) غالب کے الفاظ میں: ع جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

(۴) سعدی شیرازی نے کسی ذاتی یا پھر فنی تجربے کے تحت کہا تھا:

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد!

(۵) گویا:

قفس سے خود ہی پرندہ رہا کِیا مَیں نے
پھر اس کے بعد یہ سوچا کہ کیا کِیا مَیں نے

[طارق نعیم]

(۶) زبان دان و زبان شناس و لغت نویس شان الحق حقی کا مضمون (اردو الفاظ میں چھوت چھات) پڑھنے کے بعد رخنہ اور جوڑ کے فارسی اور مقامی لفظوں کے درمیان واوِ عطف کا استعمال مناسب معلوم ہوا۔ [مترجم]

(۷) (عبدالمجید سالک)

(۸) (ساحر لدھیانوی بتصرف)

(۹) ہاں یہ دل بے غرض نہیں، یعنی 'قابلِ اعتبار' ہیں ہم لوگ (حبیب الرحمٰن)

(۱۰) (خورشید رضوی)

(۱۱) کہ:

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِعام رکھ دیا